تدبر

لاہور

جاری کردہ :

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

نئی اشاعت

امام حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ کی مندرجہ ذیل تالیف مطالعہ فرمایئے

حکمت قرآن

موضوعات:

امام فراہیؒ کا تصور حکمت
حکمت کی اصل اور اس کی فروع
حکمت اور قرآن حکیم
دین اسلام کا نظام
دین اسلام کی بنیادیں

حکمت کا مفہوم
حکمت کی تعلیم اور اس کا حصول
حکیم کا طرز فکر و تعلیم
مذاہب پر غور کا طریقہ

ترجمہ = خالد مسعود

قیمت -- /84 روپے

فاران فاؤنڈیشن

122 - فیروز پور روڈ۔ اچھرہ' لاہور 54600

فون = 7595200

اسباق النحو

مصنف: خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم' فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لیے کافی ہے۔ اس سے
عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی"۔

مولانا امین احسن اصلاحی

قیمت: 36 روپے

شائع کردہ: ادارہ تدبر قرآن و حدیث مسلم کالونی رحمان سٹریٹ سمن آباد لاہور

جاری کردہ
مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:
خالد مسعود

تدبر لاہور

شمارہ 64

جون 1999ء

ربیع الاول 1420ھ

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد
ماجد خاور
محبوب سبحانی
سعید احمد

قیمت: /10 روپے
سالانہ: /40 روپے
بیرون ملک: /200 روپے

فہرست

تذکرہ و تبصرہ		
کیا پل صراط سے مومنین کو بھی گزرنا ہو گا؟	خالد مسعود	2
تدبر حدیث		
کتاب البیوع۔ صحیح بخاری	امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی	6
نظر بد اور آفتوں کا علاج	امین احسن اصلاحی / سعید احمد	20
مقالات		
یہود مدینہ کو دعوت اسلام	خالد مسعود	30
قیامت کی ضرورت	محبوب سبحانی	39
تصانیف مولانا اصلاحی (۲)	عبدالخالق فاروقی	45
تبصرہ کتب	ادارہ	55

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد لاہور

مطبع: المطبعۃ العربیۃ لاہور

خالد مسعود

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کیا پل صراط پر سے مومنین کو بھی گزرنا ہوگا؟

قرآن فاؤنڈیشن لاہور کے بانی و سرپرست محترم ڈاکٹر محمد عثمان نے ماہنامہ محدث لاہور میں چھپنے والے ایک مضمون "کیا پل صراط سے مسلمانوں کو بھی گزرنا ہوگا؟" کے بارے میں ہماری رائے دریافت کی ہے- یہ مضمون سورہ مریم کی آیت ۷۱ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب ہی کے ایک استفسار کے جواب میں جناب حافظ صلاح الدین یوسف نے قلمبند کیا ہے- استفسار یہ تھا کہ صاحب تدبر قرآن نے اپنی تفسیر میں آیت و ان منکم الا واردھا (تم میں سے ہر ایک کو بہر حال اس میں داخل ہونا ہے) میں خطاب صرف کفار سے مانا ہے- جبکہ عام لوگ اس کے تحت یہ مانتے ہیں کہ مومن و کافر ہر ایک کو جہنم میں لازماً جانا ہوگا- صاحب تدبر قرآن اس تصور کو مفسرین کی غلطی قرار دیتے ہیں اور اس کو قرآن کی دوسری آیت اولئک عنھا مبعدون (انبیاء ۱۰۱)(جن کے لئے ہمارا اچھا وعدہ ہے وہ اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے) کے خلاف ہے- حافظ صاحب نے اپنے مضمون میں دوسرے مضمون کو زیادہ صحیح اور اولی بالصواب قرار دیا ہے کیونکہ اس کی تائید پل صراط سے متعلق متعدد صحیح احادیث سے ہوتی ہے-

محترم ڈاکٹر صاحب کے علم میں یہ بات ہوگی کہ صاحب تدبر قرآن نے پون صدی سے زیادہ عرصہ پر محیط اپنی تحریروں اور تقریروں میں روایت اور کلام پر مبنی طریقہ ء تفسیر پر جرح کی اور اس کی غلطیوں کی طرف توجہ دلائی- انھوں نے تفسیر میں خود قرآن ہی پر اعتماد کرنے اور اسی سے مستنبط اصولوں کی روشنی میں تفسیر بیان کرنے پر زور دیا- انھوں نے اپنے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ کے مرتب کردہ ان اصولوں کو زیادہ شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا اور انھی پر مبنی اپنی تفسیر لکھی- یہ اصول نہایت سادہ اور عام فہم ہیں- یعنی یہ کہ آیت کو سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کی تفسیر بیان نہ کی جائے بلکہ نظم کلام کا لحاظ رکھا جائے- پھر قرآن مجید کے نظائر و شواہد کو پیش نظر رکھا جائے- ان سے ہٹ کر تفسیر کرنے میں غلطی کا اندیشہ ہوتا ہے- نیز الفاظ کے ایسے معانی لیے جائیں جو معروف ٹکسالی عربی میں لیے جاتے ہوں- تکلف کر کے کوئی مفہوم بنانے کی کوشش

نہ کی جائے- جب ایک مفسر اپنی تفسیر کی حدود کو خود متعین کر رہا ہو تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جانچا جائے کہ کسی آیت کی تفسیر میں اس نے اپنے مجوزہ اصولوں سے انحراف تو نہیں کیا- آیئے اس اعتبار سے آیت پر ایک نظر ڈالتے ہیں-

(ا) 'ورود' کا لفظ قرآن مجید میں سات آٹھ مقامات پر آیا ہے- اس کا مفہوم کسی گھاٹ پر پہنچنا ہے- خاص اس مفہوم میں یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں استعمال ہوا ہے کہ ورد ماء مدین (قصص: ۲۳)(وہ مدین کے چشمہ پر پہنچا) فرعون کے بارے میں آیا ہے کہ اوردھم النار (وہ ان کو دوزخ کے گھاٹ پر پہنچائے گا) یعنی جن لوگوں کا وہ دنیا میں پیشوا بنا رہا، قیامت کے دن ان کا پیشوا بن کر ان کو جہنم کے گھاٹ پر اتارے گا- اسی ضمن میں بئس الورد المورود (اترنے کے لیے یہ کتنا برا گھاٹ ہوگا) کے الفاظ استعمال ہوئے- اسی مادہ سے اسم فاعل کی صورت میں 'وارد' کا لفظ زیر بحث آیت میں بھی آیا ہے اور سورہ انبیاء میں بھی- اس کے معنی جہنم کے گھاٹ پر اترنے والا کے ہوں گے- جہنم میں داخل ہونا اس تک پہنچنے کا منطقی نتیجہ ہوگا-

(ب) وہ سلسلہ کلام جس میں زیر نظر آیت آئی ہے ان لوگوں سے متعلق ہے جو مرنے کے بعد از سر نو جی اٹھنے کو اور آخرت کے تصور کو مستبعد مانتے ہیں- ان کے لیے آخرت کے واقع ہونے اور پھر مجرمین کے جہنم میں ڈالے جانے کے مختلف مراحل کی تصویر کشی کر دی ہے- اثنائے کلام میں غائب کے اسلوب کو بدل کر مخاطب کے اسلوب میں ان کو متنبہ کر دیا ہے کہ یہ تمھی لوگ ہو گے کہ جو جہنم کے گھاٹ پر اتریں گے- متقین کو تو ہم نجات عطا کریں گے- غائب کو حاضر سے بدلنے کا یہ اسلوب معروف ہے- بلاغت کی کتابوں میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں- قرآن مجید میں بھی یہ اسلوب کئی جگہ استعمال ہوا ہے-

(ج) اس مضمون اور اسی اسلوب کی نظیر سورہ انبیاء کی آیات ۹۷- ۱۰۳ میں موجود ہے- وہاں بھی قیامت کے منکروں ہی کا تذکرہ ہے اور ٹھیک یہی اسلوب استعمال کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ انکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم انتم لھا واردون- (تم اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے رہے ہو جہنم کے ایندھن ہو گے- تم لازماً اس میں داخل ہونے والے ہو) یہاں بھی وارد ہی کا لفظ استعمال کیا ہے اور بلاشبہ یہ انھی لوگوں کے لیے ہے جو قیامت کے منکر اور غیر اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں- اس نظیر کی روشنی میں زیر نظر آیت کے مخاطب کے تعین میں کوئی اشتباہ نہیں رہ جاتا- لہذا مومنین کے جہنم میں داخلہ کا مضمون ان آیات

سے نہیں نکلتا۔

(د) سورہ انبیاء کی اس کے بعد کی آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اہل ایمان جہنم سے دور رکھے جائیں، اتنے دور کہ وہ اس کی سرسراہٹ بھی نہیں سنیں گے۔ جب سورہ مریم اور سورہ انبیاء کے ان مقامات میں سیاق کلام ایک سا ہے تو ہر معقول آدمی یہ مانے گا کہ سورہ مریم میں متقین کے لیے نجات کا جو ذکر ہے تو اس کی وضاحت سورہ انبیاء کی مذکورہ بالا آیت کرتی ہے۔

ان نکات کے مطابق صاحب تدبر قرآن نے آیت کی تفسیر انہی اصولوں کی روشنی میں کی ہے جو انہوں نے پوری تفسیر قرآن میں ملحوظ رکھے ہیں اور جن کو قرآن مجید سے وہ مستنبط اور منصوص مانتے ہیں۔ اب رہ گیا سوال ان روایات کا جن کا حوالہ محترم حافظ صاحب نے اپنے مضمون میں دیا ہے تو ان کی تاویل و تشریح ایک علیحدہ موضوع ہے جو احادیث کے شارح کی ذمہ داری ہے، کسی مفسر کی نہیں۔ ہم ان کی وضاحت میں محض چند نکات کی طرف توجہ دلائیں گے۔

(ا) حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما کی روایت میں یہ بات کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز حکم دے گا کہ لوگ جن کو پوجتے رہے ان کے ساتھ جمع ہو جائیں قرآن مجید سے ثابت ہے۔ قرآن میں بتایا ہے کہ اس دن لوگوں کی درجہ بندی کی جائے گی۔

(ب) ان روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کا پل منافقوں کو مومنین سے ممیز کرنے کے لیے رکھا جائے گا۔ جبکہ سورہ حدید میں نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ابتدا میں مومنین اور منافقین اکٹھے ہوں گے۔ مومنین کے ساتھ ایک روشنی ہوگی جس میں وہ چلیں گے لیکن منافقین اس سے محروم ہوں گے۔ وہ مومنین کے ساتھ ہو کر ان کی روشنی میں چلنا اور اس کا کچھ حصہ حاصل کرنا چاہیں گے لیکن مومنین کہیں گے کہ یہ نور یہاں نہیں مل سکتا۔ اس کے لئے تمہیں واپس جانا ہوگا اور از خود اسے تلاش کرنا ہوگا۔ اس کے بعد مومنین اور منافقین کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی اور منافقین اندھیرے میں اپنے سر پیٹتے رہیں گے۔ مومنین و منافقین کے درمیان امتیاز کا یہ نہایت عمدہ طریقہ اختیار کرنے کی خبر جب قرآن نے خود دے دی ہے تو پھر اسی مقصد کے لیے پل صراط کی ضرورت کہاں باقی رہی!

(ج) پل صراط کے تصور کا انکار کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں انسانوں کو جو احکام

دیے گئے ہیں ان کی حقیقت آخرت میں سامنے آئے گی۔ ہماری نمازیں، مسجدیں، روزہ اور حج کی اصلیت آخرت میں جا کر کھلے گی۔ اسی طرح آخری اتمام حجت کے لیے بھی اللہ تعالیٰ قیامت کے روز کچھ امتحان مقرر فرمائے گا، جیسا کہ بے نمازوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا جائے گا۔ دنیا میں انسانوں کو بتائے گئے صراط مستقیم کی حقیقت اگر وہاں اس طور پر سامنے آئے کہ وہ ایک بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز دھار کا پل ہے جس کے دونوں جانب آنکڑے اور کانٹے ہوں جو مجرموں کو اچک کر جہنم میں گرا دیں تو یہ تعبیر نہایت معنی خیز اور حقیقت کے مطابق ہے۔ حضورؐ نے یہ بھی تو فرمایا ہے کہ صراط مستقیم کے دونوں جانب ترچھے راستے واقع ہیں جن میں سے ہر ایک پر شیطان بیٹھا ہوتا ہے جو اپنی طرف بلا کر انسان کو بے راہ کر دیتا ہے۔ تو شیطان کی دعوت پر بے راہ روی اختیار کرنے والوں کو اگر جہنم کے صراط پر آنکڑوں سے واسطہ پڑے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ ان پر آخری حجت تمام کر دے گا۔

(د) ایک قابل غور بات یہ ہے کہ احادیث میں نہایت اہم مواقع پر مجمعوں کے سامنے کی گئی آنحضرتؐ کی تقاریر (مثلاً خطبہ حجۃ الوداع) تو جستہ جستہ اقتباسات کی صورت میں سامنے آئی ہیں لیکن آخرت کے متعلق دو تین صحابہ کی روایت سے مروی نہایت مفصل بیانات کتب حدیث میں موجود ہیں اور ہیں یہ متشابہات کی نوعیت کے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ راویوں نے مختلف روایتوں کو یکجا کر کے ایک مضمون مرتب کر دیا ہے اور اس کی نسبت نبی ﷺ کی طرف اس طرح کر دی ہے جیسے وہ پورا بیان حضور ہی کا ہو۔

ان اشارات کی روشنی میں ہمارا خیال یہ ہے کہ روایات کو ان کے میرٹ پر جانچنا اور ان کو قرآن مجید کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے، نہ کہ روایات کو اس قدر حاوی کر دیا جائے کہ قرآن کے واضح بیانات سے بھی ان کی خاطر انحراف کیا جائے۔

==============

یہ خبر قارئین کے لیے باعث مسرت ہوگی کہ مولانا حمید الدین فراہیؒ کی دو اہم عربی کتابیں "امعان فی اقسام القرآن" اور "الرای الصحیح فی من ہو الذبیح" جو عرصے سے نایاب تھیں دار القلم ص ب ۵۲۳ دمشق نے نہایت اعلیٰ معیار طبع کے ساتھ شائع کر دی ہیں۔ ان کی جدید دور کے تقاضوں کے مطابق ایڈیٹنگ محترم ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی نے کی ہے اور انہی کی کاوش سے یہ کتابیں عالم عرب میں روشناس ہوئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی اس خدمت کو قبول فرمائے اور انہیں اس کا اجر عطا فرمائے۔

مولانا امین احسن اصلاحی

کتاب البیوع صحیح بخاری
بیع کے احکام

باب۱۲۹۰: شراء النبی ﷺ بالنسیئة
باب آنحضرت ﷺ کا ادھار خریدنا-

۱۹۳۹- حدثنا معلی بن اسد حدثنا عبدالواحد حدثنا الاعمش قال ذکرنا عند ابراهیم الرهن فی السلم فقال حدثنی الاسود عن عائشةؓ ان النبی ﷺ اشتریٰ طعاما من یهودی الی اجل و رهنه درعا من حدید-

ترجمہ :-اعمش کہتے ہیں کہ ہم نے ابراہیم نخعی سے ادھار لے کر کچھ گروی رکھنے کے بارے میں گفتگو کی-انہوں نے کہا کہ مجھ سے اسود نے حضرت عائشہؓ کی روایت بیان کی کہ آنحضرت ﷺ نے ایک یہودی سے ایک مدت مقرر کر کے ادھار غلہ خریدا اور اپنی لوہے کی زرہ اس کے پاس گروی رکھ دی-

۱۹۴۰- حدثنا مسلم حدثنا هشام حدثنا قتاده عن انسؓ و حدثنی محمد بن عبدالله بن حوشب حدثنا اسباط ابوالیسع البصری حدثنا هشام الدستوائی عن قتاده عن انسؓ انه مشی الی النبی ﷺ بخبز شعیر و اهالةسخنة و لقد رهن النبی ﷺ درعاله بالمدینة عند یهودی و اخذ منه شعیرا لاهله ولقد سمعته یقول ما امسیٰ عند آل محمد ﷺ صاع برولا صاع حب و ان عنده تسع نسوة-

ترجمہ : حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وہ آنحضرت ﷺ کے پاس جو کی روٹی اور چربی، جس سے بو آ رہی تھی، لے گئے اور اس وقت آنحضرت ﷺ کی حالت یہ تھی کہ آپ نے اپنی زرہ مدینے میں ایک یہودی کے پاس گروی رکھوائی ہوئی تھی اور اس سے اپنی بیویوں کے لیے جو لیے تھے اور میں نے ان کو یہ بیان کرتے بھی سنا کہ محمد ﷺ کے گھر والوں کے پاس کبھی شام کو ایک صاع گیہوں یا غلے کا جمع نہ رہا حالانکہ آپ کی نو بیویاں تھیں-

وضاحت :ایک دور میں آنحضرت ﷺ کے حالات بے شک ایسے رہے ہیں کہ بسا اوقات کھانے کو گھر میں کچھ نہ ہوتا تھا- کبھی پانی اور کھجور کے سوا کوئی چیز میسر نہ ہوتی البتہ آنحضرتؐ کے اور ان کے گھر والوں کے یہ

حالات مدنی زندگی کے شروع میں نہایت سخت رہے تھے لیکن فتوحات کے بعد بہر حال غربت کا وہ حال نہ تھا جو یہاں بیان ہوا ہے- یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ابتدائی مدنی دور میں حضور ﷺ کی نو بیویاں نہیں تھیں- سیاسی، سماجی اور دینی مصالح کی بنیاد پر نو بیویاں جو ہوئیں تو تاریخ بتاتی ہے کہ وہ ساری آخری دور میں ہوئیں- ابتدائی دور میں حضرت سودہؓ و حضرت عائشہؓ سمیت شاید تین یا چار ازواج مطہرات تھیں اور اسی زمانے میں آپ نے قرض لیا اور اپنی زرہ گروی رکھی- فتوحات کے بعد مسلمان بہر حال فاتح کی حیثیت سے رہتے تھے اور آنحضرت ﷺ کی بھی اپنی اختیار کردہ ایثار کی زندگی ضرور تھی لیکن یہ نوبت نہیں تھی کہ بدر و حنین اور احزاب کا فاتح اپنی زرہ کسی یہودی کے ہاں گروی رکھے- لہٰذا میرے نزدیک روایت کرنے والوں نے ماضی کو مستقبل میں اور مستقبل کو ماضی میں ملا دیا ہے یعنی ترتیب اس کی بالکل غیر منطقی ہو گئی ہے- زرہ گروی رکھنے کی بات ابتدائی دور مدینہ کی ہے اور آپ کی نو بیویاں آخری دور میں ہوئیں-

باب۱۲۹۱: کسب الرجل وعمله بیده
باب اس بارے میں کہ آدمی کو اپنی ضروریات اپنی محنت اور کمائی سے پوری کرنی چاہئیں-

۱۹۴۱- حدثنا اسمٰعیل بن عبدالله قال حدثنی ابن وهب عن یونس عن ابن شهاب قال حدثنی عروة بن الزبیر ان عائشةؓ قالت لما استخلف ابوبکر الصدیقؓ قال لقد علم قومی ان حرفتی لم تکن تعجز عن مؤنةاهلی و شغلت بامرالمسلمین فسیاکل آل ابی بکر من هذا المال و یتحرف للمسلمین فیه-

ترجمہ :- حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ بنائے گئے تو انہوں نے کہا کہ میری قوم کے لوگوں کو خوب پتہ ہے کہ میرا کاروبار میرے اہل و عیال کی ضرورت کے لیے کافی تھا- اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول رہوں گا تو ابوبکر کے گھر والے مسلمانوں کے مال ہی میں سے اپنی ضروریات پوری کریں گے اور ابوبکر مسلمانوں کے لیے اس میں جدوجہد کریں گے-

وضاحت : روایت کا مفہوم واضح ہے- اس میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ بننے کے بعد بیت المال سے گھر کے اخراجات کا جواز بیان کیا ہے- وہ فرماتے ہیں کہ خلیفہ بننے کے بعد میں حکومت کی ذمہ داریوں میں مشغول ہو گیا ہوں اور اس کے سوا چارہ نہیں کہ مسلمانوں کے مال میں سے اپنی ضروریات پوری کروں- دوسری روایات میں جو تفصیل آئی ہے وہ بڑی دلچسپ ہے کہ خلیفہ بننے کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے کپڑے کے

تھان کندھے پر ڈالے اور بازار کی طرف روانہ ہوئے- راستے میں بڑے لوگوں میں سے حضرت عمرؓ یا کوئی اور ملے اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا؟ انہوں نے کہا کہ یہ نہ کروں تو بیوی بچے کھائیں گے کیا؟ حضرت عمرؓ نے کہا اسے رہنے دیجئے اور یہ طے پایا کہ حضرت ابو بکرؓ اپنی ضروریات بیت المال سے پوری کریں گے-

حضرت ابو بکرؓ نے یہ جو فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے لیے جدوجہد کریں گے کہ ان کے مال میں برکت بڑھے اور اضافہ ہو تو یہ خلیفہ کی ذمہ داری ہے کہ جو مال مسلمانوں کا اس کے قبضہ میں آتا ہے وہ اس کو مختلف طریقوں سے بڑھانے کی کوشش کرے-

۱۹۴۲- حدثنا محمد حدثنا عبدالله بن یزید حدثنا سعید قال حدثنی ابوالاسود عن عروة قال قالت عائشة کان اصحاب رسول الله ﷺ عمال انفسهم وکان یکون لهم ارواح فقیل لهم لو اغتسلتم رواه همام عن ہشام عن ابیه عن عائشةؓ-

ترجمہ : حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ اپنے کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتے تھے تو ان کے بدن سے پسینے کی بو نکلتی تھی تو ان سے کہا جاتا اگر تم نہا لیا کرو تو بہتر ہے-

وضاحت :ارواح روح کی جمع ہے- صحابہ کرام کھیتی باڑی، تجارت، مویشی پالنا غرض جتنے کام تھے اپنے ہاتھ سے کرتے تھے جس کی وجہ سے ان کے کپڑوں میں پسینہ سے بو پیدا ہو جاتی تھی- اسی بنیاد پر ان سے کہا گیا کہ اگر جمعہ کے جمعہ غسل کر لیا کریں تو بہتر ہے- یہ آداب میں سے بھی ہے- جہاں اجتماعی کام ہو تو ہر آدمی کو اپنی انفرادی خصوصیات میں ترمیم کرنی پڑے گی- دوسروں کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا- نہانا پڑے گا، کپڑے بدلنے پڑیں گے، خوشبو ملے تو وہ بھی لگائی جائے- ایسا نہ کیا جائے تو اجتماعات میں طبیعت کا نشاط مفقود ہو جاتا ہے-

روایت کا زور اس بات پر ہے کہ لوگ اپنے ہاتھ سے کام کرتے تھے اور مقصود اس سے یہ ہے کہ یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے بلکہ اصلی شرف یہی ہے کہ آدمی اپنا رزق اپنے ہاتھ سے کمائے-

۱۹۴۳- حدثنا ابراهیم بن موسیٰ اخبرنا عیسیٰ عن ثور عن خالد بن معدان عن المقدام عن رسول الله ﷺ قال ما اکل احد طعاما قط خیرا من ان یاکل من عمل یده وان نبی الله داؤد علیه السلام کان یاکل من عمل یده-

ترجمہ : حضرت مقدام رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ کسی شخص نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا

جو اس نے اپنے ہاتھ کی کمائی سے فراہم کیا ہو اور اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے اپنی ضروریات پوری کیا کرتے-

وضاحت :- جو روزی اپنے ہاتھ کی کمائی کی ہوتی ہے، اس سے زیادہ پاکیزہ، بابرکت اور لذیذ کوئی کھانا نہیں ہوتا- اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو اپنے ہاتھ کی کمائی ہے اور پھر پاکیزہ بھی، تو اس کا ذرہ ذرہ آدمی کے اندر پاکیزہ خون پیدا کرے گا جو اس کی رگوں میں ایک مجاہد کا خون بن کر دوڑے گا-

اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ تھے اور بادشاہ بھی معمولی نہیں، بنی اسرائیل کو ان کی پوری تاریخ پر فخر ہے اور کیوں نہ ہو- انہوں نے بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک اہم مرحلہ میں ان کے دشمن جالوت کا مقابلہ کیا اور اس کو قتل کیا- اس وقت یہ ایک غریب قبیلہ کے گڈریے اور بہت کم سن نوجوان تھے- جالوت پر فتح پانے کے بعد حضرت داؤد کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے- یہ جوہر قابل ان کے اندر تھا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عظیم سلطنت دی جس کی تمنا اسرائیلی آج تک رکھتے ہیں- لوہے کی اعلیٰ صنعت کا آغاز حضرت داؤد کے عہد حکومت میں ہوا- ان کے دور میں زرہ سازی شروع ہوئی- تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں بری طاقت بڑی حد تک مکمل ہو گئی تھی- اس تمام کروفر کے باوجود حضرت داؤدؑ اپنی ابتدائی غربت کو نہیں بھولے- اتنی بڑی سلطنت کا حکمران بن جانے کے باوجود وہ اپنی محنت کی کمائی کھاتے تھے- یہاں روایت کو مختصر کر دیا ہے- کان یاکل من عمل یده کی تفصیل بہت ہے- مراد یہ ہے کہ اپنی تمام ضروریات اپنی کمائی سے پوری کرتے تھے-

۱۹۴۴- حدثنا یحییٰ بن موسیٰ حدثنا عبدالرزاق اخبرنا معمر عن همام بن منبه حدثنا ابوهریرةؓ عن رسول الله ﷺ ان داؤد علیه السلام کان یاکل من عمل یده-

ترجمہ : حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے محنت کر کے اپنی کمائی سے کھاتے-

وضاحت :- اس روایت کی وضاحت اوپر گزر چکی ہے- یہ بھی یاد رکھیے کہ یہ روایات سب کتاب البیوع میں آ رہی ہیں- بحث ساری کی ساری ہاتھ کی کمائی کی ہے جبکہ بیع کی تعریف یہ ہے کہ مبادلہ الشئی بالشئی - ہاتھ کی کمائی کی بحث پاکیزہ زندگی اور اخلاقیات کی بحث ہے- اس کو بیع سے تعلق نہیں-

۱۹۴۵- حدثنا یحیی بن بکیر حدثنا اللیث عن عقیل عن ابن شهاب عن ابی عبید مولیٰ عبدالرحمن بن عوف انه سمع اباهریرةؓ یقول قال رسول الله ﷺ لان یحتطب احدکم حزمة علی ظهره خیر من ان یسأل احدا فیعطیه او یمنعه۔

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بات کہ تم میں سے کوئی اپنی پیٹھ پر لکڑیوں کا ایک گٹھا لیے ہوئے ہو (جس کو بازار میں بیچ کر اپنی روزی کمائے) اس بات سے کہیں بہتر ہے کہ وہ کسی سے سوال کرے، پھر معلوم نہیں وہ اسے کچھ دے یا نہ دے۔

وضاحت: یہ ہدایت بہت پاکیزہ اور شاندار ہے۔ آدمی کے اندر عزت نفس اور حوصلہ مندی ہونی چاہیے۔ ضرورت کے وقت سائل بن کر لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلانا کمینگی ہے۔ ایک خوددار آدمی جنگل میں جاکر لکڑیاں کاٹے اور پیٹھ پر لاد کر ان کو بیچے اور جو چند پیسے مل جائیں اس سے اپنا پیٹ پالے لیکن کسی کے آگے مدد کے لیے ہاتھ نہ پھیلائے تو یہ اعلیٰ ظرف اور بلند کردار کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی مدد فرماتا ہے اور اس کو ذلت سے بچاتا ہے۔

۱۹۴۶- حدثنا یحیی بن موسی حدثنا وکیع حدثنا هشام بن عروة عن ابیه عن الزبیر بن العوام قال قال النبی ﷺ لان یاخذ احدکم احبله خیر له من ان یسأل الناس۔

ترجمہ: زبیر بن العوام کہتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ بات کہ تم میں سے کوئی اپنی رسیاں اٹھائے بہتر ہے اس بات سے کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

وضاحت: رسیوں سے مراد لکڑیاں باندھنے کی رسیاں ہیں۔ روایت حسب سابق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی رسیاں اٹھائے، جنگل میں جاکر لکڑی کاٹے اور باندھ کر بازار میں لے جائے، پھر بیچ کر کمائے کھائے تو یہ بہتر ہے اس بات سے کہ لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائے۔

باب ۱۲۹۲ السهولة والسماحة فی الشراء والبیع و من طلب حقا فلیطلبه فی عفاف۔

باب خرید و فروخت میں نرمی اور سیر چشمی کا معاملہ کرنا اور جو اپنا حق مانگے تو پاکیزہ طریقہ سے مانگے۔

یطلبه فی عفاف کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ مطالبہ شرافت کے ساتھ، پاکیزگی کے ساتھ اور مہذب طریقہ سے کرے۔

۱۹۴۷- حدثنا علی بن عیاش حدثنا ابو غسان محمد بن مطرف قال حدثنی محمد بن المنکدر عن جابر بن عبداللهؓ ان رسول الله ﷺ قال رحم الله رجلا سمحا اذا باع و اذا اشتری و اذا اقتضیٰ۔

ترجمہ: حضرت جابر بن عبداللہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو بیچتے، خریدتے اور تقاضا کرتے وقت فیاضی دکھاتا ہے۔

وضاحت: سمحا کے معنی فیاض، دل کا سخی، سیر چشم کے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آدمی کنجوس بنیے کے طریقے پر کسی کے درپے نہ ہو جائے۔ کسی سے کچھ وصول کرنا ہے تو نرمی سے طلب کرے۔ کسی نے معذرت کی تو قبول کرلے اور مہلت دیدے۔ خرید و فروخت میں آسمان و زمین کے قلابے نہ ملائے کہ مال تو گھٹیا ہو اور ثابت کرنا چاہے کہ اس میں کوئی خرابی نہیں۔ ہر معاملہ میں فیاضی، رواداری اور خوشدلی ہونی چاہیے۔ معاملات کے لیے یہ بہت عمدہ روایت ہے۔

باب ۱۲۹۳ من انظر موسرا

باب اس شخص کے بارے میں جو مالدار کو مہلت دے

۱۹۴۸- حدثنا احمد بن یونس حدثنا زهیر حدثنا منصور ان ربعی بن حراش حدثه ان حذیفة حدثه قال قال رسول الله ﷺ تلقت الملائكة روح رجل ممن کان قبلکم فقالوا أعملت من الخیر شیأ قال کنت آمر فتیانی ان ینظروا و یتجاوزوا عن الموسر قال فتجاوزوا عنه وقال ابو مالک عن ربعی کنت ایسر علی الموسر وانظر المعسر و تابعه شعبة عن عبدالملک عن ربعی و قال ابو عوانة عن عبدالمالک عن ربعی انظر الموسر و اتجاوز عن المعسر و قال نعیم بن ابی هند عن ربعی فاقبل من الموسر واتجاوز عن المعسر۔

ترجمہ: حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ فرشتوں کی ملاقات ایک ایسے شخص کی روح سے ہوئی جو تم سے پہلے لوگوں میں سے تھا تو ملائکہ نے پوچھا آپ نے دنیا میں کوئی نیکی کا کام بھی کیا ہے تو اس

نے کہا میں اپنے نوکروں کو یہ حکم دیتا تھا کہ تم لوگ مہلت دو اور درگزر کرو کشادہ حال سے بھی- تو فرشتوں نے اس کو چھوڑ دیا- ابو مالک نے ربعی سے یوں روایت کی ہے کہ میں مالدار پر آسانی کرتا تھا اور نادار کو مہلت دیتا تھا-- عبدالملک نے ربعی سے یوں روایت کیا ہے کہ میں مالدار کو مہلت دیتا تھا اور نادار کو معاف کر دیتا تھا اور نعیم بن ابی ھند نے ربعی سے یوں روایت کی کہ میں مالدار کا وعدہ قبول کر لیتا تھا اور نادار کو معاف کر دیتا تھا-

باب ۱۲۹۴- من انظر معسرا

باب اس شخص کے بارے میں جس نے نادار کو مہلت دی

۱۹۴۹- حدثنا هشام بن عمار حدثنا يحيى بن حمزة حدثنا الزبيدى عن الزهرى عن عبيدالله بن عبدالله انه سمع اباهريرةؓ عن النبى ﷺ قال كان تاجر يداين الناس فاذا راى معسرا قال لفتيانه تجاوزوا عنه لعل الله يتجاوز عنا فتجاوز الله عنه-

ترجمہ : حضرت ابو ھریرہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک تاجر تھا جو لوگوں کو قرض دیتا تھا- وہ جب دیکھتا کہ آدمی تنگ حال ہے تو اپنے آدمیوں سے کہتا کہ اس سے درگزر کرو تاکہ اللہ تعالیٰ ہم سے بھی درگزر فرمائے تو اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر کیا-

وضاحت : پہلی روایت میں مالک کی نوکروں کو اس ہدایت کہ 'کشادہ حال سے درگزر کرو' کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ درگزر کا معاملہ تنگ دستوں کے ساتھ تو کرتے ہی ہو، اس کو کشادہ حالوں تک وسعت دے دو-

آدمی کو معاملات میں بہت ہی روادار، کشادہ دل اور نرم خو ہونا چاہیے- وہ آدمی ہی کیا جو ہر ایک سے پائی پائی کا حساب کرتا پھرے- میرے نزدیک ایک شریف آدمی کا کردار یہ ہونا چاہیے کہ اگر کسی سے کچھ لینا ہے اور وہ آدمی کچھ واپس کرتا ہے تو چپکے سے چھپا کر جیب میں رکھ لے- اس کے سامنے رقم گننا بھی شرافت کے منافی ہے- اگر دینے والے نے کچھ کم بھی دیا ہو تو کیا ہوا، امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بہتر صلہ دے گا-

پہلی روایت میں روح سے فرشتوں کی سر راہے ملاقات کا جو ذکر آیا ہے کہ وہ پوچھیں گے کہ آپ کوئی نیکی بھی کر کے آئے ہو تو اس کا کوئی محل نہیں- قرآن مجید سے اس طرح کے امکانات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا- اس میں اگر فرشتوں کے تبصرے ملتے ہیں تو حساب کتاب کے وقت یا جنت اور جہنم میں داخلہ کے وقت ملتے ہیں- فرشتے اہل جنت کا خیر مقدم کریں گے اور جہنیوں سے یہ پوچھیں گے کہ کیا خدا کی ہدایت لے کر

انبیاء تمہارے پاس نہ آئے تھے، اگر آئے تھے تو تم نے ان کی تکذیب کر کے کیوں اپنی عاقبت خراب کر لی-

حدیثوں میں کتنی روایتیں ایسی آئی ہیں جن میں کسی جزوی عمل پر آدمی کی مغفرت کا بیان ہے جیسے بعینہ وہی معمولی عمل مغفرت کا سبب بن گیا ہو- یہ بات دین کی اصولی تعلیم کے خلاف ہے- اصول کی تعلیم جو قرآن نے دی ہے اس کے مطابق کوئی بھی بڑا یا چھوٹا عمل، خواہ وہ حج کا ہو، جہاد کا ہو یا ہجرت کا ہو، قبول نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لیے نہ کیا گیا ہو- اگر کوئی اور نیت ہو گی تو اس عمل کی کوئی وقعت نہیں- اسی طرح آدمی کے چھوٹے چھوٹے گناہ اس کے نیک اعمال سے دھل جاتے ہیں مگر جتنے بھی بڑے گناہ ہیں جن سے حقوق العباد پر اثر پڑتا ہے یا حقوق اللہ متاثر ہوتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ ان گناہوں کے صدور کے بعد فوراً توبہ کی جائے، استغفار کیا جائے اور معاملہ کی اصلاح کی جائے تب اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمائے گا- لیکن اگر توبہ کی توفیق نہیں ملی اور گناہ زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن گیا اور اسی حالت میں موت آ گئی تو یہ گناہ آدمی کو جہنم میں پہنچانے کا سبب بن جائے گا-

اب ایک درمیانی حالت ہے کہ فوری توبہ تو نہیں کی لیکن موت سے پہلے توفیق ہو گئی تو اس پر قرآن خاموش ہے- اس خاموشی سے امید رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ درگزر فرمائے گا اور ڈرتے بھی رہنا چاہیے کہ کہیں پکڑے نہ جائیں- باقی رہ گیا کہ کوئی صاحب چھوٹے موٹے کام کریں، بچوں کے سر پر ہاتھ پھیریں، کچھ چیزیں لوگوں میں تقسیم کرتے رہیں، لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں کشادہ دلی کا مظاہرہ کریں تو یہ نیکی کے کام ضرور ہیں لیکن یہ نجات کا ذریعہ نہیں-

احادیث میں بہت سی روایتیں ایسی آئی ہیں، اور زیر بحث روایت بھی انہی میں سے ہے، جن میں پچھلے لوگوں کے حوالہ سے بات کی گئی ہے، گویا یہ واقعہ کسی پہلی امت کے کسی فرد کے ساتھ پیش آیا- معلوم ہوتا ہے اس طرح کے قصے بنی اسرائیل میں رائج رہے ہوں گے- ان سب کا انداز واعظانہ ہے- گویا لوگ ترغیب و ترہیب کے لیے ان کو بیان کرتے رہے- یہی قصے ہمارے ہاں احادیث میں داخل ہو گئے- بعض روایتوں میں بیان کسی صحابی سے منسوب ہے اور بعض میں خود نبی ﷺ سے- ایک روایت میں راوی ایک ایسے ہی قصہ کی نبی ﷺ کی طرف نسبت کی تردید کرتے ہیں- یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے- جب حضور خود شریعت دینے والے اور دین کے اصول متعارف کرانے والے تھے تو آپ مجہول راویوں کے ترغیب و ترہیب کے قصوں کو کیوں اہمیت دیتے- ایک توجیہ یہ کی جا سکتی ہے کہ ممکن ہے کسی خاص موقع پر آنحضرت ﷺ

نے کوئی قصہ سنایا ہو۔ یہ ممکن ہے۔ البتہ موقع واضح نہیں۔ یہی واقعہ بطور تنبیہ بھی تو سنایا جا سکتا ہے کہ احمق لوگوں نے دین کے نام پر کیسی کیسی باتیں دین میں داخل کر دیں۔

اس طرح کی واعظانہ باتوں کا اثر یہ ہوا کہ عوام خوش ہو گئے کہ چھوٹی چھوٹی نیکیاں کر کے ہم بھی مغفرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اب وہ بڑے احکام کو تو پس پشت ڈالتے ہیں کہ ان پر عمل آسان نہیں ہوتا اور قربانی چاہتا ہے، لیکن چھوٹے چھوٹے بھلائی کے کاموں پر مغفرت کی امید لگائے رکھتے ہیں اور ہمارے واعظین بھی یہ قصے سنا سنا کر معافی کے پروانے بانٹتے رہتے ہیں۔

میں ان روایتوں کو محدثین کے اسی اصول پر پرکھتا ہوں کہ اگر معمولی نیکی پر بہت بڑے اجر کی خبر کسی روایت میں دی گئی ہو تو یہ اس روایت کے ضعف کی دلیل ہوتی ہے۔ عمل اور جزا کے معاملات میں قرآن نے جو رہنمائی دی ہے ہمیں اسی پر اعتماد کرنا چاہیے اور واعظانہ قسم کی باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

باب ۱۲۹۵- اذا بين البيعان و لم يكتما و نصحا و يذكر عن العداء بن خالد قال كتب لى النبى ﷺ هذا ما اشترى محمد رسول الله ﷺ من العداء بن خالد بيع المسلم لمسلم لا داء ولا خبثة ولا غائلة و قال قتاده الغائلة الزنا والسرقة والاباق و قيل لابراهيم ان بعض النخاسين يسمى ارى خراسان و سجستان فيقول جاء امس من خراسان جاء اليوم من سجستان فكرهه كراهية شديدة و قال عقبة بن عامر لا يحل لامرئ يبيع سلعة يعلم ان بها دآء الا اخبره-

باب جب بیچنے والا اور خریدار دونوں صاف صاف بیان کر دیں، کچھ چھپائیں نہیں اور ایک دوسرے کی بہتری چاہیں

اور عداء بن خالد سے منقول ہے کہ نبی ﷺ نے (مجھ سے کوئی چیز لی تو) یہ تحریر لکھ دی کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خرید اعداء بن خالد سے اور مسلمان کی بیع مسلمان کے لیے اس طرح ہونی چاہیے کہ نہ اس میں کوئی خرابی ہو، نہ کوئی دھوکہ ہو اور نہ فریب ہو۔ اور قتادہ نے کہا کہ الغائلہ سے مراد زنا، چوری اور غلام کا بھاگنا ہے۔ اور ابراہیم نخعی سے پوچھا گیا کہ بعض دوکاندار اپنے اڈوں کا نام خراسان اور سجستان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مال کل ہی خراسان سے آیا، یہ مال آج ہی سجستان سے پہنچا ہے، تو ابراہیم نے اس کو بہت ہی مکروہ گردانا۔ اور عقبہ بن عامر نے کہا کہ جس کو اپنے مال کا کوئی عیب معلوم ہو اور وہ اسے بیچ رہا ہو تو خریدار سے اس کو بیان کر دے۔

وضاحت: اس باب میں اقوال ہیں۔ روایت کا حوالہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے عداء بن خالد سے کوئی چیز خریدی اور یہ تحریر لکھ دی کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے خرید اعداء بن خالد سے اور مسلم کی بیع مسلم کے لیے اس طرح ہونی چاہیے کہ اس میں کوئی خرابی اور دھوکہ نہ ہو۔ یہ نصیحت کے کلمات ہیں۔ آنحضرت ﷺ کو موقع ملا اور آپ نے نصیحت فرما دی کہ مومن کا معاملہ مومن سے ایسا ہونا چاہیے کہ دغل فصل اور فساد سے پاک ہو۔ ان کلمات کا اور کوئی محل نہیں اور یاد نہیں پڑتا کہ آنحضرت ﷺ نے اور کسی کاروباری تحریر میں یہ لکھا ہو۔ جہاں تک اس روایت کا تعلق ہے یہ بس یہیں مذکور ہے۔ صحاح کی بعض کتابوں میں یہ روایت اس طرح آئی ہے کہ عداء بن خالد نے حضور سے کوئی چیز خریدی۔ قتادہ نے الغائلہ سے مراد زنا، چوری اور اباق یعنی غلام کا بھاگ جانا بتایا ہے۔ بھلا بتایئے یہ شرح کس لغت سے ہے۔

مال تجارت جب مخصوص علاقوں سے آئے تو لوگ اس کی مارکیٹیں قائم کر لیتے ہیں۔ اسی طرح لوگوں نے خراسان اور سجستان کے علاقوں کا مال فروخت کرنے کے اڈے قائم کیے ہوئے تھے۔ اس لیے کہ مال انہی جگہوں سے آتا تھا اور لوگ کھڑے کھڑے آواز لگاتے تھے کہ ابھی ابھی تازہ مال خراسان سے آیا ہے یا سجستان سے آیا ہے۔ خرید لیجیے ورنہ نکل جائے گا۔ ابراہیم نخعی سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ یہ سب لغویات ہیں۔ ان کا خیال یہ رہا ہو گا کہ لوگ اس طرح خریداروں کو دھوکہ دے کر مال نکالتے ہیں۔ ابن عامر کا امام صاحب نے یہ قول نقل کیا ہے کہ اگر مال میں کوئی عیب ہے تو خریدار کو بتا دینا چاہیے کہ مال میں یہ نقص ہے۔

۱۹۵۰- حدثنا سليمان بن حرب حدثنا شعبة عن قتاده عن صالح ابى الخليل عن عبدالله بن الحارث رفعه الى حكيم بن حزام قال قال رسول الله ﷺ البيعان بالخيار مالم يتفرقا او قال حتى يتفرقا فان صدقا و بينا بورك لهما فى بيعهما و ان كتما و كذبا محقت بركة بيعهما-

ترجمہ: حکیم بن حزام کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معاملہ کرنے والے اس وقت تک اختیار رکھتے ہیں جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں۔ پھر اگر وہ سچ بولیں اور عیب وغیرہ صاف صاف بیان کریں تو ان کی بیع میں برکت ہو گی اور اگر چھپائیں اور جھوٹ بولیں تو ان کی بیع کی برکت مٹا دی جائے گی۔

وضاحت: معاملہ کے فریقین یعنی خریدار اور دوکاندار دونوں کو اختیار دیا گیا ہے، خریدار کو یہ کہ وہ خریدا ہوا مال واپس کر دے اور دوکاندار کو یہ کہ وہ مال فروخت کرنے سے معذرت کر دے جب تک کہ دونوں معاملہ

کر کے جدا نہیں ہو جاتے اور جائے معاملہ پر ہی موجود ہوتے ہیں- اگر جدا ہو گئے اور خریدار مال خرید کر دوکان سے اٹھ کر چلا گیا تب خیار آپ کا ختم- پھر آپ نے جو لیا وہ آپ کا اور دکاندار نے جو بیچا وہ اس کو منسوخ نہیں کر سکتا- حدیث میں اصولی بات یہی بتائی گئی ہے- البتہ فقہاء نے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر لیے ہیں- میں اس وقت فقہ کی بحث چھیڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں-

حدیث کے باقی حصہ میں یہ ہدایت ہے کہ مال میں اگر کوئی عیب تھا، دکاندار نے وہ صاف صاف بیان کیا اور چھپایا نہیں اور خریدار نے رضامند ہو کر مال لے لیا تو ان کے معاملہ میں برکت ہو گی- یہ برکت بڑی چیز ہے- اس میں شے موجود رہتی ہے اور اس کا خزانہ کبھی خالی نہیں ہوتا- اور اگر برکت نہ ہو اور ڈھیروں مال ہو تو ہر طرف نحوست، غربت اور مصیبت نظر آتی ہے- حضورؐ نے فرمایا کہ اگر معاملہ کرنے والوں نے اصل حقیقت کو چھپایا اور جھوٹ بول کر مال کی خرید و فروخت کی تو ان کی بیع کی برکت مٹا دی جائے گی-

باب۱۲۹۶-بیع الخلط من التمر
باب اچھی اور خراب کھجور ملی جلی بیچنے کے بارے میں

۱۹۵۱-حدثنا ابو نعیم حدثنا شیبان عن یحیی عن ابی سلمة عن ابی سعید قال کنا نرزق تمر الجمع وهو الخلط من التمر وکنا نبیع صاعین بصاع فقال النبی ﷺ لا صاعین بصاع ولا درهمین بدرهم-

ترجمہ: ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ ہم کو سب قسم کی کھجوریں ملی جلی ملا کرتی تھیں تو ہم اس کے دو صاع دے کر ایک صاع اچھی کھجور لے لیتے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا دو صاع کھجور کا ایک صاع کے بدل بیچنا درست نہیں ہے اور نہ دو درہم کا ایک درہم کے ساتھ مبادلہ جائز ہے-

وضاحت: معلوم ہوتا ہے کہ قسم قسم کی کھجوریں بیت المال میں جو صدقے وغیرہ کے طور پر آتی تھیں سب رلا ملا کر مستحقین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں تو لوگ ان ملی جلی کھجوروں کے دو صاع کے بدلے ایک صاع اچھی کھجوریں خرید لیتے تھے- نبی ﷺ کو پتہ چلا تو آپ نے اس معاملہ سے منع فرمایا-

راوی نے یہاں اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ کس شکل میں آپ نے اس معاملہ سے منع فرمایا ہے- ہاتھوں ہاتھ معاملہ کی صورت میں یا ادھار میں- اگر کوئی معاملہ ید ابید یعنی ہاتھوں ہاتھ ہو رہا ہے تو یہ بات ٹھیک معلوم ہوتی ہے کہ خراب چیز زیادہ دے کر اچھی چیز کم لے لی جائے- مثلاً عمدہ قسم کے قلمی آم ہیں تو اگر

کوئی دو ٹوکرے دیسی آم دے کر ایک ٹوکرا عمدہ آم لے لیتا ہے تو یہ بات ٹھیک ہے- دونوں قسم کے آموں کے ایک ہی دام تو نہیں ہوں گے- اس طرح چاول ہیں باسمتی بھی اور اری بھی تو دونوں کا ایک ہی بھاؤ تو نہیں ہو گا- آمنے سامنے کے معاملہ میں قیمت کا فرق شے کی نوعیت کے لحاظ سے جائز ہے- آنحضرت ﷺ نے اس معاملہ سے جو منع فرمایا ہے تو یہ نسیہ یعنی ادھار کی صورت میں ہو گا- مثلاً اگر کوئی کہے کہ آج اتنا چاول دیتا ہوں اور چند دن بعد اس سے مختلف مقدار میں لوں گا تو یہ جائز نہیں اس لیے کہ یہ ربا کی شکل ہے- اور ظاہر ہے کہ یہ منع ہے-

درہم کا درہم سے مختلف قیمتوں پر مبادلہ عجیب سا لگتا ہے- لیکن اگر یہ بات ذہن میں ہو کہ درہم چاندی کے ہوتے تھے اور وہ گھس گھس کر کبھی بہت کم وزن کے رہ جاتے اور لوگ مبادلہ میں ان کے وزن کا لحاظ کرتے تو بات سمجھ میں آتی ہے- میرے خیال میں یہ ہدایت بھی معاملہ کے ادھار ہونے کی صورت میں ہے-

باب۱۲۹۷-ما قیل فی اللحام والجزار
باب گوشت بنانے والے اور قصابوں کے بارے میں

۱۹۵۲- حدثنا عمر بن حفص حدثنا ابی حدثنا الاعمش قال حدثنی شقیق عن ابی مسعود قال جاء رجل من الانصار یکنی ابا شعیب فقال لغلام له قصاب اجعل لی طعاما یکفی خمسة من الناس فانی ارید ان ادعوا النبی ﷺ خامس خمسة فانی قد عرفت فی وجهه الجوع فدعا هم فجاء معهم رجل فقال النبی ﷺ ان هذا قد تبعنا فان شئت ان تاذن له فاذن له و ان شئت ان یرجع رجع فقال لا بل قد اذنت له-

ترجمہ: ابو مسعود روایت کرتے ہیں کہ انصار میں سے ایک شخص نے، جن کی کنیت ابو شعیب تھی، اپنے غلام سے جو قصاب تھا کہا کہ میرے لیے کھانا تیار کر جو پانچ آدمیوں کے لیے کافی ہو- میرا ارادہ ہے کہ میں نبی ﷺ سمیت پانچ آدمیوں کو کھانے پر بلاؤں کیونکہ میں نے آپ کے چہرے پر بھوک کے آثار دیکھے ہیں- پھر اس نے آپ کو دعوت دی تو ان کے ساتھ ایک صاحب زیادہ آ گئے تو نبی ﷺ نے فرمایا کہ یہ صاحب ہمارے ساتھ آ گئے ہیں- اگر آپ چاہیں تو ان کو اجازت دے دیں اور اگر آپ کہیں تو یہ لوٹ جائیں- تو انہوں نے کہا کہ نہیں، میں اجازت دیتا ہوں، یہ بھی شامل ہوں گے-

وضاحت :- ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک بے تکلف معاشرہ تھا- وہ صاحب بن بلائے آبھی گئے اور حضور ﷺ نے صفائی کے ساتھ صورت حال بتادی، لیکن صاحب خانہ معقول آدمی تھے انہوں نے اجازت دے دی- یہ روایت ہمیں تعلیم دیتی ہے کہ اگر کوئی مہمان بن بلائے آجائے تو میزبان کو چاہیے کہ خوشدلی سے اس کو قبول کرلے- نیکی اور فیاضی کا یہی تقاضا ہے- لیکن کسی کو ناخواندہ مہمان بننا نہیں چاہیے کیونکہ اس سے میزبان پر ایک ذمہ داری عاید ہوتی ہے- یہاں دیکھیے حضور ﷺ کو میزبان سے اجازت لینی پڑی- ہاں جب کوئی آہی گیا ہو تو مسلمان کو خندہ پیشانی کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرنا چاہیے-

یہ روایت یہاں سیاق وسباق کے لحاظ سے بالکل بے جوڑ ہے- اس لیے کہ اوپر والی روایت میں اشیاء کے کم وبیش مبادلہ کی بات ہے اور آگے والی روایت جھوٹ اور عیب چھپانے سے برکت اٹھ جانے کے بارے میں ہے- صحیح بخاری کے جو راوی ہیں، خواہ مناولہ کے طریقہ پر انہوں نے روایت کا حق حاصل کیا ہو یا شیخ کے درس میں شریک ہوکر قرات لیا قرات علیہ کے طریقہ پر، تو ان کے جو نسخے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ لائبریریوں میں محفوظ ہیں ان میں بہت سے نسخوں میں یہ روایت وہاں ہے جہاں مختلف پیشوں کا اکٹھا ذکر ہوا ہے اور بعض میں اس طرح ہے جیسا کہ زیر مطالعہ نسخہ میں ہے- اس کی وجہ یہی ہے کہ امام بخاری کو مکمل طریقہ پر کتاب کی تنقیح کا موقع نہ ملا اور اس کی روایت شروع ہوگئی- جس راوی نے جس ترتیب سے سنا یا جس طریقہ سے اپنے نسخہ میں لیا ہے وہ کتابوں میں آیا ہے- اس حدیث کو پیشوں کے ذیل میں بیان کیا جائے تو وہاں اس کے بیان کا ایک موزوں محل ہے-

باب ۱۲۸۹ ما یمحق الکذب والکتمان فی البیع

باب اس بارے میں کہ کاروبار میں جھوٹ بولنا اور مال کے عیب کو چھپانا اس کی برکت کو ختم کردیتا ہے-

برکت کا مفہوم بیان کرنے میں تو مشکل ہے لیکن ہم میں سے ہر شخص اس کو سمجھتا ہے- یہ واقعہ ہے کہ بہت سا ناجائز مال آتا ہے تو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ خوب کمائی کی ہے لیکن ایسا مال اپنے ساتھ ہزاروں ایمانی و اخلاقی آفتیں اور مصیبتیں صحت کے اعتبار سے، خاندان کے اعتبار سے اور معاشرے کے اعتبار سے لاتا ہے- یہ مال آفتوں کا ایک جال ہوتا ہے اور آدمی سمجھ نہیں پاتا کہ یہ سب کہاں سے آگئیں- آج پڑھے لکھے لوگوں کی زندگی پر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اس جال میں بہت بڑی اکثریت پھنسی ہوئی ہے- مال اگر ملے اور زندگی کی ساری قدر وقیمت برباد کردے، کار، کوٹھی، وزارت، صدارت سب کچھ ہو لیکن زندگی کی حقیقی اقدار تمام کی تمام برباد ہوجائیں تو ایسے مال پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوتی ہے اور اگر مال میں برکت ہوگی تو ان شاء اللہ ان تمام آفات سے محفوظ رہیں گے- گو مال تھوڑا سا ہے لیکن آپ کی عقل سلامت ہے، آپ کا کردار سلامت ہے اور آپ کا ریکارڈ آپ کے رب کے آگے اچھا ہے اور آپ صراط مستقیم پر چل رہے ہیں، آپ کی اولاد آپ سے سبق لے رہی ہے اور ان کا مستقبل روشن ہے تو یہ برکت ہوتی ہے-

۱۹۵۳- حدثنا بدل بن المحبر حدثنا شعبة عن قتادہ قال سمعت ابا الخلیل یحدث عن عبداللہ بن الحارث عن حکیم بن حزامؓ عن النبی ﷺ البیعان فی الخیار مالم یتفرقا او قال حتی یتفرقا فان صدقا و بینا بورک لھما فی بیعھما و ان کتما و کذبا محقت برکۃ بیعھما-

ترجمہ : حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ خرید و فروخت کرنے والے اس وقت تک اختیار رکھتے ہیں جب تک کہ وہ الگ نہ ہوئے ہوں- اگر انہوں نے اپنے معاملہ میں راستی اختیار کی اور جو عیوب ہیں کھول دیئے تو ان کے معاملہ میں برکت ہوگی- اور اگر انہوں نے کچھ چھپایا اور جھوٹ بولا تو ان کی بیع کی برکت مٹ جائے گی-

وضاحت : یہ روایت تین حدیث اوپر گزر چکی ہے- وہاں اس کی وضاحت کی جاچکی ہے-

اختیار کے بارے میں کچھ فقہی سوالات ہیں اور وہ پیچیدہ ہیں- اس لیے کہ بعض چیزوں کے عیب و ہنر کے اندازے کے لیے کچھ وقت چاہیے- فرض کیجئے کہ آپ نے بکری خریدی تو بکری کیسی ہے، کتنا دودھ دیتی ہے، اس کا کھڑے کھڑے تو اندازہ نہیں ہوسکتا- عقل کا تقاضا ہے کہ اس کے لیے اختیار میں کچھ مہلت ہونی چاہیے تو دوسری حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مہلت ہے-

(ترتیب : سید اسحاق علی)

مولانا امین احسن اصلاحی

نظر بد اور آفتوں کا علاج

(موطا امام مالک کی کتاب العین کی روایات)

ما جاء فی نزع المعالیق و الجرس من العین
نظر بد سے بچنے کے لیے پٹے اور گھنٹیاں اتارنے کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن عبداللہ بن ابی بکر عن عباد بن تمیم ان ابا بشیر الانصاری اخبرہ انہ کان مع رسول اللہ ﷺ فی بعض اسفارہ- قال فارسل رسول اللہ ﷺ رسولا، فقال عبداللہ بن ابی بکر حسبت انہ قال والناس فی مقیلھم لا تبقین فی رقبۃ بعیر قلادۃ من وبر اوقلادۃ الاقطعت - قال یحییٰ سمعت مالکا یقول اریٰ ذالک من العین

ترجمہ : عباد بن تمیم کہتے ہیں کہ ابو بشیر انصاری نے ان کو خبر دی کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ایک سفر میں آپ کے ساتھ تھے- رسول اللہ ﷺ نے ایک آدمی کو بھیجا (اور عبداللہ بن ابی بکر کہتے ہیں کہ میرا گمان یہ ہے کہ عباد نے یہ بھی کہا کہ اس وقت لوگ قیلولہ کر رہے تھے) کہ کسی اونٹ کی گردن میں نہ چھوڑ یا بالوں کا کوئی پٹہ مگر یہ کہ وہ کاٹ دیا جائے- یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے سنا کہ وہ کہتے تھے کہ میرے خیال میں یہ حکم ان پٹوں کے بارے میں تھا جو نظر بد سے بچنے کے لیے باندھے گئے تھے-

وضاحت : جانوروں کے گلے میں پٹے اور گھنٹیاں باندھنے کا ہر ملک میں رواج ہے- دیہاتوں میں کسان صبح کے دھندلکے میں مویشی لے کر نکلتے ہیں تو کچھ نظر نہیں آتا- امکان ہوتا ہے کہ کوئی بے خبر آدمی جانوروں سے ٹکرا جائے- گھنٹیاں ایسے لوگوں کو متنبہ کر دیتی ہیں- تو یہ اہتمام ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے- بعض لوگوں کے مد نظر زیب و زینت کا پہلو ہوتا ہے- کچھ لوگ شان اور فخر کے اظہار کے لیے پٹے اور گھنگھریاں باندھتے ہیں- ایک طبقہ وہ بھی ہے جو اوہام پرست ہوتا ہے- ان کو وہم ہوتا ہے کہ ان کے جانوروں کو نظر لگ جائے گی تو وہ جانوروں کے بالوں سے بنے ہوئے پٹے یا تعویذ جانوروں کے گلے میں لٹکاتے ہیں- امام مالک کے نزدیک رسول اللہ ﷺ کا یہ حکم اس آخری قسم کے پٹوں کے بارے میں تھا- یہ ان کا قیاس ہے اور درست

معلوم ہوتا ہے-

الوضو من العین
نظر بد کے سبب سے وضو کا حکم

حدثنی یحییٰ عن مالک عن محمد بن ابی امامۃ بن سھل بن حنیف انہ سمع اباہ یقول اغتسل ابی سھل بن حنیف بالخرار فنزع جبۃ کانت علیہ و عامر بن ربیعۃ ینظر- قال و کان سھل رجلا ابیض حسن الجلد- قال فقال لہ عامر بن ربیعۃ ما رأیت کالیوم ولا جلد عذراء، قال فوعک سھل مکانہ و اشتد و عکہ فاتی رسول اللہ ﷺ فاخبر ان سھلا و عک و انہ غیر رائح معک یا رسول اللہ فاتاہ رسول اللہ ﷺ فاخبرہ سھل بالذی کان من امر عامر، فقال رسول اللہ ﷺ علام یقتل احدکم اخاہ الا برکت ان العین حق توضاء لہ فتوضأ لہ عامر فراح سھل مع رسول اللہ ﷺ لیس بہ باس-

ترجمہ : ابو امامہ روایت کرتے ہیں کہ میرے باپ سہل بن حنیف نے خرار میں غسل کیا- وہ ایک جبہ پہنے ہوئے تھے، جسے اتارا تو عامر بن ربیعہ ان کو دیکھ رہے تھے- سہل بہت گورے اور خوبصورت جسم کے آدمی تھے- عامر بن ربیعہ نے کہا کہ آپ جیسا جسم آج تک میں نے کسی کنواری کا بھی نہیں دیکھا- سہل کو اسی وقت بخار آگیا اور بخار شدید ہو گیا- رسول اللہ ﷺ کے پاس آدمی آیا اور ان کو بتایا کہ سہل بن حنیف کو تپ چڑھ گیا ہے اور وہ تو اب آپ کے ساتھ جانے کی طاقت نہیں رکھتے- رسول اللہ ﷺ ان کے پاس آئے تو سہل نے جو بات عامر بن ربیعہ کی طرف سے ہوئی تھی وہ آپ کو بتائی- اس پر رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں بلا وجہ قتل کرتا ہے- تم نے ان کو برکت کی دعا کیوں نہیں دی- نظر تو حق ہے- اس کے لیے وضو کرو- عامر نے اس کے لیے وضو کیا تو سہل ٹھیک ہو گئے اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ اس حال میں روانہ ہو گئے کہ ان کو کوئی تکلیف نہ تھی-

حدثنی مالک عن ابن شھاب عن ابی امامۃ بن سھل بن حنیف انہ قال: رای عامر بن ربیعۃ سھل بن حنیف یغتسل، فقال ما رأیت کالیوم ولا جلد

مخبأة فلبط سهل فاتی رسول الله ﷺ فقیل یا رسول الله هل لک فی سهل بن حنیف والله ما یرفع رأسه فقال هل تتهموون له احدا؟ قالوانتهم عامر بن ربیعة فتغیظ علیه فقال علام یقتل احدکم اخا ہ الابرکت اغتسل له فغسل عامر وجهه و یدیه و مرفقیه ورکبتیه و اطراف رجلیه وداخلة ازاره فی قدح ثم صب علیه فراح سهل مع الناس لیس به باس۔

ترجمہ: ابو اسامہ بن سہل کہتے ہیں کہ عامر بن ربیعہ نے دیکھا کہ سہل بن حنیف غسل کر رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ میں نے آج تک اتنا خوبصورت جسم کسی پردہ نشین کا بھی نہیں دیکھا۔ اس پر سہل وہیں گر پڑے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی آیا اور پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ کو کچھ سہل کا حال بھی معلوم ہے خدا کی قسم وہ تو سر بھی نہیں اٹھا رہے۔ آپؐ نے پوچھا کیا تم ان کے بارے میں کسی کو متہم کرتے ہو۔ تو انھوں نے کہا کہ ہم تو عامر بن ربیعہ کو متہم کرتے ہیں۔ آپ عامر پر غصے ہوئے اور فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں ناحق قتل کرتا ہے۔ تو نے ان کو برکت کی دعا کیوں نہ دی، اب اس کے لیے غسل کرو۔ تو عامر نے دھویا اپنا چہرہ، دونوں ہاتھ، کہنیاں، دونوں گھٹنے، پاؤں کے اطراف اور تہمد کا اندرون ایک برتن میں۔ پھر یہ سارا پانی سہل کے اوپر ڈال دیا تو وہ ٹھیک ہو گئے اور لوگوں کے ساتھ نکلے اس حال میں کہ ان کو کوئی تکلیف نہ تھی۔

وضاحت: یہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں۔ عامر بن ربیعہ نے سہل بن حنیف کو غسل کرتے دیکھا تو ان کی خوش رنگ جلد پر ایسی نگاہ ڈالی کہ وہ نظر بد کا شکار ہو کر اسی وقت گر پڑے اور انھیں شدید بخار آ گیا۔ نظر بد ایک شیطانی کام ہے۔ انسان کے اندر جو شیطان ہوتا ہے وہ اس کا ذریعہ بنتا اور دوسرے آدمی کو متاثر کرتا ہے۔ نظر بد بھی اعمال سفلیہ کی طرح کی ایک چیز ہے۔ اس میں اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی سحر میں ہوتی ہے۔ سحر قوت متخیلہ کو متاثر کرتا ہے لیکن اتنا نہیں کہ آدمی اس کے نتیجہ میں مر جائے یا مخبوط الحواس ہو جائے۔ اس کا اثر وقتی طور پر پڑتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ جو فرمایا کہ تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں قتل کرتا ہے تو اس سے ذہن اس طرف جاتا ہے کہ نظر بد قتل تک متعدی ہو سکتی ہے۔ اسی لیے اس روایت کی بنا پر یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ نظر بد کے نتیجہ میں اگر کوئی قتل ہو جائے تو کیا نظر بد ڈالنے والا قصاص میں قتل کر

دیا جائے گا۔ فقہا کے ایک گروہ کے خیال میں وہ قتل کر دیا جائے گا جبکہ دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ شریعت میں قتل کی تحقیق کا ایک ضابطہ ہے۔ اس کے لیے شہادتیں لی جاتی ہیں، آلہ قتل دیکھا جاتا ہے، مقتول کا جائزہ لیا جاتا ہے، اس کے بعد قاضی اپنا فیصلہ صادر کرتا ہے۔ نظر بد میں شریعت کے ان ضابطوں پر عمل کرنا ممکن نہیں۔ امام نووی کی رائے میں نظر بد کے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔

دوسری طرف قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال خبیثہ میں شیطان کو کسی پر سلطان یا کامل اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ آدمی کی جان ہی لے لے۔ زیادہ سے زیادہ وہ وسوسہ اندازی کر سکتا ہے، گناہ پر ابھار سکتا ہے اور وقتی طور پر کسی مشکل میں ڈال سکتا ہے۔ اس کی روشنی میں قتل سے مراد حقیقی قتل نہیں ہو سکتا جس کا آنحضرتؐ نے حوالہ دیا ہے۔

اگرچہ دونوں روایتیں ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں لیکن ان میں بڑا فرق میرے نزدیک اس وجہ سے پیدا ہو گیا ہے کہ پہلی روایت کے راوی محمد بن ابی اسامہ ہیں جبکہ دوسری محمد بن شہاب زہری سے مروی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق نبی ﷺ نے عامر بن ربیعہ کو وضو کرنے کا حکم دیا اور سہل بن حنیف کے لیے برکت کی دعا کرنے کو کہا جس سے سہل اچھے ہو گئے۔ یہ بات قرین قیاس اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔ دوسری روایت میں ابن شہاب نے اس کو ایک ٹونکا بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق جس آدمی سے نظر بد لگی ہو اس کو نہلایا جائے۔ تمام اعضاء حتیٰ کہ زیر جامہ کے اعضا کو بھی دھو کر پانی ایک برتن میں جمع کیا جائے اور وہ تمام کا تمام مریض کے اوپر ڈالا جائے تو نظر بد کا اثر ختم ہو جائے گا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔ یہ سب اوہام ہیں۔ ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ زہری کے مقاصد میں یہ بات بھی رہی ہے کہ یہود کے اعمال سفلیہ کو اسلام میں گھسایا جائے اور ایمان بالجبت (یا اعمال سفلیہ پر ایمان) یہود کی خصوصیت رہی ہے۔ ٹونے ٹونکے وغیرہ سب جبت کے قبیل سے ہیں۔

روایت میں غسل کے اس طریقہ کے لیے شاہ ولی اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے کہ یہ ابن شہاب کی اپنی گرہ ہے۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ ان باتوں کا عقل سے کوئی تعلق نہیں۔ ٹونے ٹونکے دل سے مان لینے کی چیزیں ہیں۔ میرے نزدیک یہ قرآن کے خلاف ہیں اور یہود کے بقایا میں سے ہیں۔ صوفیوں کے ذریعے ان کو فروغ حاصل ہوا ہے۔

الرقية من العين

نظر بد کے لیے جھاڑ پھونک کرنا

حدثنی عن مالک عن حمید بن قیس المکی انه قال: دخل علی رسول الله ﷺ با بنی جعفربن ابی طالب ، فقال لحاضنتیهما ما لی اراهما ضارعین، فقالت حاضنتیهما یا رسول الله انه تسرع الیهما العین و لم یمنعنا ان نسترقی لهما الا انا لا ندری ما یوافقک من ذالک، فقال رسول الله ﷺ استرقوا لهما فانه لوسبق شیئی القدر لسبقته العین-

ترجمہ : حمید بن قیس مکی کہتے ہیں کہ جعفر بن ابی طالب کے دو بیٹے رسول اللہ ﷺ کے پاس لائے گئے- آپ نے ان کی دودھ پلانے والیوں سے کہا کہ میں ان کو کمزور کیوں دیکھتا ہوں، تو ان کی دودھ پلانے والیوں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ان کو نظر بہت جلد لگ جاتی ہے اور ہم ان کے لئے ٹونے ٹوٹکے نہیں کرتے کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ آپ اس کو پسند کریں گے یا نہیں- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ان کو جھاڑ پھونک کرالو کیونکہ تقدیر پر اگر کوئی چیز سبقت کرنے والی ہوتی تو نظر بد اس پر سبقت کر لیتی-

وضاحت : "ضارع" کمزور کو کہتے ہیں- استرقاء کا لفظ جھاڑ پھونک کروانے کے لیے آتا ہے- حدیث اپنے مفہوم میں واضح ہے- بچوں کی آیاؤں نے ان کی کمزوری کو نظر بد پر محمول کیا- ہمارے یہاں بھی عورتیں بچے کی پرورش میں اپنا کوئی قصور ماننے کو تیار نہیں ہوتیں- اگر کسی کمزور بچے کے متعلق پوچھا جاتا ہے تو یہی جواب دیتی ہیں کہ اس پر نظر بد کا اثر ہے-

اس روایت میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آنحضرت ﷺ نے یہ کیوں فرمایا کہ ان کے لیے جھاڑ پھونک کرالو- بچوں کی صحت کے لیے آپ خود دعا کر سکتے تھے- آپ کی دعا سے بہتر اور پاکیزہ کس کی دعا ہو سکتی تھی اور آپ کی دعا کے لیے حضرت علی کے بھتیجوں سے زیادہ اور کون محبوب ہو سکتا تھا- آپ فرما دیتے کہ میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں- اس کے بجائے آپ نے فرمایا کہ جھاڑ پھونک کرالو- نظر بد کے اثر کو زائل کرنے کا یہ بڑا کارگر نسخہ ہے؟ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی- کیا آپ روایتی جھاڑ پھونک کرنے والوں کے عمل کی تاثیر

کے قائل تھے؟ یہ بالکل ناممکن بات ہے- آنحضرت کا مدعا بھی اگر ہو سکتا ہے تو وہ دعا کا ہو سکتا ہے جو ایک مشروع چیز ہے- روایت میں اگر استرقاء کا لفظ آگیا ہے تو اسے دعا ہی پر محمول کرنا چاہیے-

حدثنی عن مالک عن یحییٰ بن سعید عن سلیمان بن یسار ان عروۃ بن الزبیر حدثه ان رسول الله ﷺ دخل بیت ام سلمۃ زوج النبی ﷺ و فی بیت صبی یبکی فذکروا له ان به العین قال عروۃ فقال رسول الله ﷺ الا تسترقون له من العین-

ترجمہ : عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اپنی زوجہ حضرت ام سلمہؓ کے گھر میں داخل ہوئے تو گھر میں ایک بچہ رو رہا تھا- آپ کو بتایا گیا کہ اس کو نظر لگ گئی ہے- عروہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم اسے نظر بد سے جھاڑ پھونک کیوں نہیں کراتے؟

وضاحت : یہاں بھی روایت میں وہی مشکل ہے جو پچھلی روایت میں تھی- قرآن مجید میں اور خود رسول اللہ ﷺ کے عمل میں جو چیز ہے وہ دعا ہے، جھاڑ پھونک نہیں- دعا میں کلمات طیبہ کا ہونا ضروری ہے- کوئی شرکیہ کلمہ نہ ہو، ان کو پڑھ کر مریض پر پھونک دیں تو یہ عمل درست ہو گا- اگر اس کو استرقاء کہا گیا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں-

ما جاء فی اجر المریض

بیمار کے اجر کے بارے میں

حدثنی عن مالک عن زیدبن اسلم عن عطاء بن یسار ان رسول الله ﷺ قال: اذا مرض العبد بعث الله تبارك و تعالیٰ الیه ملکین فقال انظرا ما ذا یقول لعواده فان هو اذا جاء وه حمد الله واثنیٰ علیه رفعا ذالک الی الله عزوجل و هو اعلم فیقول لعبدی علی ان توفیته ان أدخله الجنة ، و ان انا شفیته ان ابدل له لحما خیرا من لحمه،ودما خیرا من دمه ،و ان اکفر عنه سیئاته-

ترجمہ: عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی بندہ بیمار ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف دو فرشتے بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو کہ وہ اپنی عیادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے- اگر وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہو، اس کی ثنا کرتا ہو، تو وہ دونوں فرشتے خدا کے پاس اس کی خبر لے جاتے ہیں، حالانکہ خدا خود جانتا ہے- تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے کا میرے اوپر ذمہ ہے کہ اگر میں اس کو وفات دوں تو اس کو جنت میں داخل کروں گا اور اگر اس کو شفا دوں تو اس کے گوشت کو اس سے بہتر گوشت سے اور خون کو اس سے بہتر خون سے بدل دوں گا اور اس کے گناہ بھی معاف کردوں گا-

وضاحت: اللہ اپنے شاکر و صابر بندوں پر بڑا مہربان ہے- ایسے بندوں کو اگر کانٹا بھی چبھتا ہے تو وہ اس کو ان کے لیے گناہوں کا کفارہ بنا دیتا ہے- اگر یہ نہ ہو تو ہم لوگ جو قدم قدم پر گناہ کرتے ہیں وہ کس طرح سے دور ہوں گے-

حدثنی عن مالک عن یزید بن خصیفة عن عروة بن الزبیر انه قال: سمعت عائشة زوج النبی ﷺ تقول قال رسول الله ﷺ لا یصیب المؤمن من مصیبة حتی الشوکة الاقص بها او کفربها من خطایاه لا یدری یزیدایهما قال عروة

ترجمہ: عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہؓ زوجہ نبی ﷺ سے سنا کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مومن کو کوئی دکھ نہیں پہنچتا یہاں تک کہ کانٹا چبھنے کا بھی مگر یہ کہ اسے اس کا قصاص دیا جاتا ہے یا یہ اس کی خطاؤں کا کفارہ بن جاتا ہے- یزید کو یہ معلوم نہیں کہ عروہ نے ان دونوں میں سے کون سی بات کہی-

وضاحت: یہ روایت امام مسلمؒ نے بھی لی ہے- پچھلی روایت میں یہی بات دوسرے حوالہ سے بیان ہوئی ہے-

حدثنی مالک عن محمدبن عبدالله بن ابی صعصعة انه قال: سمعت ابا الحباب سعید بن یسار یقول سمعت اباهریرة یقول: قال رسول الله ﷺ من یرد الله به خیراً یصب منه-

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کی بہتری چاہتا ہے تو اس کی طرف سے اس کو آزمائش پہنچتی ہے-

وضاحت: اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے اور قرآن مجید میں اس کی وضاحت یوں ہے کہ خیر سے یا تکلیف سے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لیتا رہتا ہے- خیر سے اس کے شکر کا اور تکلیف سے اس کے صبر کا امتحان ہوتا ہے- زندگی بھر یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے- اللہ تعالیٰ اگر کسی آزمائش میں ڈالتا ہے تو اس سے خیر ہی مطلوب ہوتا ہے- اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہمارے ساتھ کوئی دشمنی تو ہو نہیں سکتی- یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں غفلت سے جھنجوڑنا مقصود ہو- ہم جاگ نہ رہے ہوں تو کسی طرح سے وہ ہمیں ابتلا میں ڈال کر خواب غفلت سے جگا کر متوجہ کردے، تو یہ بہت بڑا خیر ہے-

حدثنی عن مالک یحییٰ بن سعید ان رجلا جاء ه الموت فی زمان رسول الله ﷺ فقال رجل هنیئا له مات ولم یبتل بمرض، فقال رسول الله ﷺ و یحک وما یدریک لوان الله ابتلاه بمرض یکفر به عنه من سیئاته-

ترجمہ: یحییٰ بن سعید سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص کی موت کا وقت آگیا تو ایک شخص نے کہا کتنا مبارک ہے یہ شخص- مرا اور کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوا- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تیرا ناس ہو- تم کو کیا معلوم کہ اگر اللہ اس کو مرض میں مبتلا کرتا تو وہ اس کے گناہوں کو جھاڑنے والا بنتا-

وضاحت: معلوم ہوا کہ یہ نہیں چاہنا چاہیے کہ ہم کو کوئی مرض نہ لاحق ہو، مگر یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ موت دے تو آسان دے- میں یہ دعا ضرور کرتا ہوں- مرض تو آزمائش ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اس کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے- اس سے گھبرانا نہیں چاہیے-

التعوذ و الرقیه من المرض

مرض سے پناہ مانگنا اور جھاڑ پھونک کرنا

حدثنی عن مالک عن یزید بن خصیفة عن عمرو بن عبدالله بن کعب اسلمی اخبره ان نافع بن جبیر اخبره عن عثمان بن ابی العاص انه اتی رسول

الله ﷺ - قال عثمان و بی وجع قد کاد یهلکنی: قال فقال رسول الله ﷺ امسحه بیمینک سبع مرات و قل اعوذ بعزة الله وقدرته من شرما اجد- قال ففعلت ذالک فاذهب الله تبارك وتعالیٰ ما کان بی فلم ازل آمربها اهلی و غیرهم-

ترجمہ: عثمان بن العاص سے روایت ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے- ان کو اتنا شدید درد اٹھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ انہیں ہلاک کر دے گا- رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس پر مسح کرو اپنے دائیں ہاتھ سے سات مرتبہ اور دعا کرو کہ میں اللہ کی عزت اور قدرت کی پناہ مانگتا ہوں اس شر اور دکھ سے جو مجھے پہنچا ہے- وہ کہتے ہیں کہ میں نے ایسا کیا تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے میری وہ تکلیف دور کر دی- اس کے بعد میں برابر اپنے گھر والوں اور دوسرے لوگوں کو اس دعا کی تلقین کرتا ہوں-

وضاحت: یہ دعا آنحضرت ﷺ نے سکھائی ہے- مسنون الفاظ یہی ہیں- نہایت مختصر اور آسان ہے- سب کو یاد کر لینی چاہیے- یہ استرقاء کا مسنون طریقہ ہے- اس طریقے سے دعا مانگ کر پانی پلانے یا تکلیف کے مقام پر پھونک مارنے یا ہاتھ پھیرنے کا نفسیاتی اثر پڑتا ہے اور مریض کے لیے نفسیاتی اثر کی بھی اہمیت ہوتی ہے- اس طرح کے جھاڑ پھونک میں کوئی برائی نہیں- جو چیز بری ہے وہ یہ ہے کہ کلمات شرکیہ ہوں- جتنی بھی معروف و مسنون دعائیں پیغمبر کی ہیں وہ اختیار کرنی چاہئیں- سات مرتبہ کا جو عدد ہے یہ بہت سی روایتوں میں آیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دین میں اعداد کا کچھ اعتبار ہے- بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن میں اعداد کا لحاظ ہے- آخر نماز کے پانچ اوقات ہیں- بعض نمازوں کی رکعتیں دو، بعض کی تین، اور بعض کی چار ہیں- تو یہ سب بغیر حکمت کے نہیں- دین میں ان کا لحاظ ہے- اگر کوئی چیز قرآن مجید سے یا صحیح حدیث سے ثابت ہو تو ہر چند اس کی حکمت نہ معلوم ہو اس کی پیروی کرنی چاہیے- یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بلا حکمت بات ہے- ہاں اگر کسی ایرے غیرے کی بتائی ہوئی ہو تو اس کی کوئی اہمیت نہیں-

حدثنی عن مالک عن ابن شہاب عن عروة بن الزبیر عن عائشة ان رسول الله ﷺ کان اذا اشتکی یقرأ علی نفسه بالمعوذات و ینفث- قالت فلما اشتد وجعه کنت انا اقرأ علیه بیمینه رجاء برکتها-

ترجمہ: حضرت عروہ بن زبیر روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کہتی تھی کہ آنحضرت ﷺ جب بیمار ہوتے تو آپ اپنے اوپر معوذات پڑھتے اور پھونکتے- فرماتی ہیں کہ جب آپ کی تکلیف زیادہ ہوئی تو میں آپ پر پڑھ کر پھونکتی اور برکت کے خیال سے آپ کے ہاتھ پر مسح کرتی-

وضاحت: معوذات سے قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس مراد ہیں- یہ دونوں سورتیں ہر طرح کے شر سے، آفت اور شیطان کے حملوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنے کی دعا ہیں- اس لیے تمام تکالیف میں معوذتین پڑھنا اللہ کی مدد و نصرت کو آواز دینے کے مترادف ہے- دعا کے ساتھ پھونک مارنا اور ہاتھ پھیرنا خلاف عقل ہے نہ خلاف دین- مریض پر اس کا بھی اثر ہوتا ہے-

حدثنی عن مالک عن یحییٰ بن سعید عن عمرة بنت عبدالرحمن ان ابابکر الصدیق دخل علی عائشة وهی تشتکی و یهودیة ترقیها،فقال ابوبکر ارقیهابکتاب الله-

ترجمہ: عمرہ بنت عبدالرحمن سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق حضرت عائشہؓ کے پاس آئے، وہ بیمار تھیں اور ایک یہودی عورت ان کو جھاڑ پھونک کر رہی تھی- حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا کہ کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو-

وضاحت: معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ شادی سے پہلے کا ہے- شادی کے بعد تو آنحضرت ﷺ سے بڑا کوئی دعا کرنے والا نہیں تھا- یہ قرینہ ہے کہ ہجرت کے بعد شروع زمانے کا واقعہ ہے- شادی کے بعد کا نہیں- اس وقت ابھی مسلمانوں میں علاج کرنے والے نہیں ہوں گے اور پرانی روایت یہ چلی آرہی ہوگی کہ بعض لوگ ایسے لوگوں سے عمل کروا لیتے ہوں گے جن کو جوگی یا بڑا مستجاب الدعوات خیال کرتے رہے ہوں گے- تو اسی طرح کی یہ یہودی عورت ہوگی- حضرت ابوبکر نے یہ فرمایا کہ کتاب اللہ سے جھاڑ پھونک کرو- کتاب اللہ سے یہاں مراد تورات معلوم ہوتی ہے کیونکہ یہودی عورت قرآن مجید کو تو جانتی نہیں ہوگی- اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں آ کر استرقاء کے علم میں یہ ترمیم ہوئی ہے کہ اب جھاڑ پھونک یونہی نہیں کہ جو چاہے کر دے بلکہ کتاب اللہ کے کلمات سے ہو، اگرچہ وہ کتاب پہلے ہی کی ہو- (ترتیب: سعید احمد)

خالد مسعود

یہود مدینہ کو دعوت اسلام

مدینہ کو ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ کو اہل کتاب کے جس طبقہ سے واسطہ پڑا اور جو آپ کے مخاطب بنے، یہود تھے۔ سیاسی اور معاشرتی لحاظ سے ان کی دو قسمیں تھیں۔ ایک نسلی یہودی جو بنو نضیر، بنو قریظہ اور بنو قینقاع، تین قبائل کی صورت میں اطراف مدینہ میں آباد تھے، دوسرے غیر نسلی یہودی جن کا تعلق مشرک عرب قبائل کے ساتھ تھا لیکن وہ یہود کی تعلیم سے متاثر ہو کر یہودیت اختیار کر چکے تھے۔ یہودیت کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ اصلاً ایک نسلی مذہب ہے اور دوسرے لوگ اگر یہودیت اختیار کر لیں تو وہ یہودی ہونے کے باوجود یہودی معاشرہ میں وہ عزت اور مرتبہ نہیں پاتے جو نسلی یہود کو حاصل ہوتا ہے۔ لہذا غیر نسلی یہود اپنے اپنے قبائل کے ساتھ تھے اور معاشرتی طور پر انھیں اپنے اپنے قبیلہ کے رسم و رواج کا خیال رکھنا اور قبیلہ کے سرداروں کا حکم ماننا پڑتا تھا۔ قرآن مجید میں نسلی یہودیوں کو 'بنی اسرائیل' اور غیر نسلی یہودیوں کو، یا مجموعی طور پر تمام یہود کو 'اہل کتاب' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے۔

ہجرت سے پہلے دوسری بیعت عقبہ کے موقع پر جب اہل یثرب نے نبی ﷺ کو ہجرت کی صورت میں اپنی میزبانی کی پیشکش کی تو ساتھ ہی یہ خدشہ بھی ظاہر کیا کہ یا رسول اللہ، ہمارے بعض تعلق والے ایسے بھی ہیں جن سے اسلام لانے کے بعد ہمیں اپنے تعلقات توڑنے پڑیں گے۔ یہ نہ ہو کہ ہم تو یہ قربانی دے دیں اور آپ کو اللہ کامیاب کرے تو آپ اپنی قوم کی طرف واپس آجائیں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ نہیں خون تو خون ہوتا ہے اور رائیگاں بہنے والا خون رائیگاں ہوتا ہے۔ میں تم میں سے ہوں اور تم مجھ سے ہو۔ جن سے تمھاری جنگ ہوگی میری بھی ان سے جنگ ہوگی اور جن سے تمھاری صلح ہے میری بھی ان سے صلح ہوگی۔ اس یقین دہانی کے بعد بیعت منعقد ہوئی۔ یہاں جن تعلق والوں کا ذکر ہے اہل سیرت کے نزدیک وہ یہود تھے اور، جیسا کہ میثاق مدینہ کی عبارت کے حوالہ سے ہم بتا چکے ہیں، اوس اور خزرج کے قبائل کی متعدد شاخوں میں بعض لوگ یہودی تھے اور آنحضرتؐ نے ان کو مہاجرین اور انصار کے مابین اس میثاق میں شریک معاہدہ قرار دیا۔ لہذا بیعت کے موقع پر اصلاً انھی یہود کا مسئلہ سامنے آیا تھا جس کو آنحضرتؐ نے اس طرح حل فرمایا کہ ان یہود کے وہی حقوق تسلیم کیے جو اوس و خزرج کے مسلمانوں کے تھے۔ یہ ایک ایسا اقدام تھا جس نے ان یہود کو متاثر کیا اور ان کو اسلام کے قریب آنے میں مدد دی۔ چنانچہ ان کے حق پسندوں نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسری طرف

انھی یہود کے ایک طبقہ کو نسلی یہودیوں نے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا اور یہ اپنے سابقہ مذہبی روابط کی بنا پر ان کے آلہ کار بن گئے۔ چونکہ یہ گھر کے بھیدی بن گئے تھے لہذا یہ مسلمانوں کے احوال سے اپنے مذہبی لیڈروں کو باخبر رکھتے اور ان کی دی ہوئی ہدایات کی روشنی میں مسلمانوں کے اندر خلفشار پیدا کرنے کی کوشش کرتے۔ تاہم اپنے قبائلی سرداروں، جو اکثر مسلمان ہو چکے تھے، کے زیر اثر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچانا ان کے بس میں نہ تھا۔ اسلام کی اصل مخالف قوت نسلی یہودی تھے۔ یہ سیاسی اثر و رسوخ کے مالک تھے۔ شمالی حجاز میں اپنے ہم مسلک قبائل کے ساتھ ان کے مضبوط روابط تھے۔ عرب قبائل ان کی علمی فضیلت سے مرعوب تھے۔ قریش کی ان کے ساتھ دوستیاں تھیں اور وہ انھی سے دعوت اسلامی کی مخالفت میں مشورے لیا کرتے اور نبی ﷺ کو زچ کرنے کے گر سیکھا کرتے۔

بنی اسرائیل (یعنی نسلی یہود) ہمیشہ سے اپنے بارے میں خوش فہمیوں میں مبتلا رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ:۔

☆ وہ اللہ کی اولاد، اس کے محبوب اور اس کا پسندیدہ گروہ ہیں۔ خدا کے محبوبوں کے ساتھ نسبت کے باعث وہ ہمیشہ سے اس کے انعامات کے حقدار رہے ہیں اور رہیں گے۔

☆ خداوند نے ان کو لوگوں کی پیشوائی کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا یہ عہد ان کے ساتھ قیامت تک کے لیے ہے، لہذا کوئی رسول بنی اسرائیل کے باہر سے نہیں آسکتا۔

☆ بزرگوں کی اولاد ہونے کے باعث ان کے لیے جہنم کی سزا نہیں ہے۔ اگر کسی یہودی کے غیر معمولی جرائم کے سبب سے اس کو سزا دینا ضروری ہوا تو اسے چند روزہ سزا دے کر جہنم سے نکال لیا جائے گا۔

مدینہ کے یہود ان تمام خوش فہمیوں میں مبتلا تھے اور ان کا چرچا کر کے عربوں پر اپنی فضیلت کا سکہ جماتے تھے۔ دوسری طرف پچھلے صحیفوں میں دی گئی بشارتوں کی بنا پر وہ ایک عظیم رسول کی بعثت کے منتظر بھی تھے۔ ان کے ربی یہ رائے ظاہر کرتے تھے کہ اس رسول کی آمد کا زمانہ قریب آچکا ہے، وہ آئے گا تو اس کے جلو میں کامرانیاں ہی کامرانیاں ہوں گی۔ چنانچہ وہ اپنے حریفوں۔ اوس اور خزرج۔ کو دھمکیاں دیا کرتے۔ وہ رسول کی آمد کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اس کی بعثت بنی اسرائیل میں سے ہوگی۔ آنحضرتؐ کی بعثت ہوئی تو بہت جلد یہود کو احساس ہو گیا کہ جس رسول کی آمد کے وہ منتظر تھے وہ آچکا ہے۔ یہ بات اس وقت یقینی ہو گئی جب ہجرت کے بعد یہود نے نبی ﷺ کی شخصیت کو اپنے درمیان پایا اور ان کے مواعظ سنے۔ لیکن چونکہ آنحضرتؐ کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا جن کو یہود ہمیشہ تحقیر سے دیکھتے رہے۔ لہذا

انھیں اپنی کم مائیگی کا شدید احساس ہو اور حضور کا بنی اسرائیل میں سے نہ ہونا یہود کے اسلام لانے میں حجاب بن گیا اور وہ حسد کی آگ میں جلنے لگے۔

ان حالات میں نبی ﷺ کا پہلا کام نسل یہود کے حوالہ سے یہ تھا کہ آپ ان کو خوش فہمیوں کی دلدل سے نکالیں تاکہ ان کے دل و دماغ اسلام کے لیے کھلیں۔ چونکہ ہر مسئلہ میں من پسند تاویلیں کر کے یہود نے خوش فہمیوں کا تانا بانا بنا ہوا تھا۔ اس لیے اصل حقائق کو اجاگر کرنے کے لیے مفصل بحث و تمحیص کی ضرورت تھی جس نے یہود کے ساتھ ایک بڑے معارضہ و مباحثہ کی راہ ہموار کر دی۔ اس کے نتیجہ میں بہت کم علمائے یہود نے اسلام کی توفیق پائی۔ ان کی عظیم اکثریت کی ذہنیت نہ اس وقت بدلی اور نہ بعد میں اس میں کوئی تبدیلی آئی۔ لہذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی دعوت اور آپ کے معارضہ کی اساسات کی یہاں وضاحت کر دی جائے۔

فضیلت یہود

اللہ تعالی جب کسی قوم کو نعمتوں سے نوازتا ہے تو اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ اللہ چاہتا ہے کہ اس قوم کے اندر خداوند کے لیے شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہو، وہ خلوص نیت کے ساتھ اس کے حضور جھک جائے اور اس کی ہدایت کو اپنائے۔ یہود کو دعوت دی گئی کہ وہ سوچیں کہ فرعون کی غلامی میں وہ کس صورت حال سے دوچار تھے۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیا جاتا اور بیٹیوں کو زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ اللہ تعالی نے یہود پر یہ احسان کیا کہ فرعون اور اس کے ساتھیوں کو سمندر میں غرق کر دیا اور بنی اسرائیل کو ان کے مال و متاع سمیت نجات بخشی۔ آزادی پانے کے بعد بجائے اس کے کہ وہ رب کے شکر گزار بندے بن کر رہتے انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کی غیر حاضری میں بچھڑے کی ایک خود ساختہ مورت کی پوجا شروع کر کے اللہ کے غضب کو دعوت دی۔ لیکن ان کے کچھ لوگوں کے اظہار ندامت پر اللہ نے ان کا گناہ معاف کر دیا تاکہ ان کے اندر احسان مندی کا جذبہ پیدا ہو۔ اللہ تعالی نے ان کے لیے ہدایت کی کتاب تورات نازل فرما کر ان پر بہت بڑا احسان کیا تو انھوں نے اپنے رسول کی بات کا یقین کرنے کے بجائے اللہ سے خود ہم کلام ہونے اور اس کا دیدار کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ اس پر بھی اللہ تعالی نے ان پر گرفت نہ فرمائی تاکہ وہ شکر گزار ہوں۔ عبور دریا کے بعد جب بنی اسرائیل ایک صحرائی علاقہ میں سفر کر رہے تھے تو ان کی مشکلات کا مداوا کرنے کے لیے اللہ تعالی نے ان کے لیے خصوصی انعام فرمایا کہ دھوپ سے بچاؤ کے لیے بادلوں کا سایہ مہیا کیا۔ بیابان میں پانی کی تنگی محسوس ہوئی تو چٹان میں سے بارہ چشمے جاری کر دیے۔ غذا کی کمی لاحق ہوئی تو من و سلوی کی نعمتیں عطا کیں۔

اس قدر انعام و اکرام کی بارش کسی بھی احسان شناس انسان کے اندر شکر گزاری کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے کافی تھی لیکن بنی اسرائیل کے بنجر دل و دماغ اس سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔ وہ ہر دم حرف شکایت زبان پر لاتے رہے اور اپنے رسول، حضرت موسیٰ علیہ السلام، کو انھوں نے زچ کیے رکھا۔ وہ خدا کی نعمتوں کو اپنا استحقاق سمجھتے رہے حالانکہ نعمتیں بطور استحقاق کسی کو حاصل نہیں ہوتیں۔ یہ تو اللہ کا فضل و احسان ہوتا ہے کہ وہ جس کو چاہے نواز دے اور پھر امتحان کرے کہ نعمت پانے والے کے اندر شکر گزاری کی کوئی رمق ہے یا نہیں۔ بنی اسرائیل کو بتایا گیا کہ نعمتیں پا کر جب انھوں نے اطاعت کی بجائے تکبر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ تعالی نے ان کو سزا دی۔ چنانچہ جب ان کو حکم دیا گیا کہ بستی میں استغفار کرتے ہوئے داخل ہوں اور انھوں نے اس ہدایت کا مذاق اڑایا تو ان پر آسمانی آفت نازل ہوئی۔ جب انھوں نے من و سلوی کی ضیافت کی بے قدری کرتے ہوئے مصر کی سبزیوں اور دالوں کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالی نے ان پر ذلت مسلط کر دی۔ علاوہ ازیں انھوں نے جب جب کوئی نافرمانی کی تو ان پر عذاب آیا۔ بنی اسرائیل کی یہ تاریخ خود بتاتی ہے کہ ان کا انعام و اکرام بزرگوں کی اولاد ہونے کا نتیجہ تھا نہ ان کی کسی ذاتی فضیلت کا بلکہ یہ محض اللہ کا فضل تھا۔ وہ اپنا فضل کسی خاندان کا فرد ہونے پر یا کسی گروہ کے ساتھ وابستگی پر نہیں کیا کرتا۔ وہ تو صرف بندے کے ایمان، عمل صالح اور آخرت پر یقین کی قدر کرتا ہے اور وہی لوگ مستحق اجر ٹھہرتے ہیں جو ان شرائط پر پورا اترتے ہوں۔

بنی اسرائیل ماضی میں بھی احسان ناشناس قوم رہے۔ یہ بات اسی طرح کے الفاظ میں صحیفہ زبور کے باب ۷۸ میں بھی سمو دی گئی ہے۔ حالانکہ معلوم ہے کہ یہ کتاب تورات کے نزول کے کئی سو سال بعد نازل ہوئی:-

> "اس نے سمندر کے دو حصے کر کے ان کو پار اتارا اور پانی کو تودہ کی طرح کھڑا کر دیا۔ اس نے دن کو بادل سے ان کی رہبری کی اور رات بھر آگ کی روشنی سے۔ اس نے بیابان میں چٹانوں کو چیرا اور ان کو گویا بحر سے خوب پلایا۔ اس نے چٹان میں سے ندیاں جاری کیں اور دریاؤں کی طرح پانی بہایا۔ تو بھی وہ اس کے خلاف گناہ کرتے ہی گئے اور بیابان میں حق تعالی سے سرکشی کرتے رہے۔ اور انھوں نے اپنی خواہش کے مطابق کھانا مانگ کر اپنے دل میں خدا کو آزمایا بلکہ وہ خدا کے خلاف بکنے لگے اور کہا کیا خدا بیابان میں دستر خوان بچھا سکتا ہے؟ دیکھو اس نے چٹان کو مارا تو پانی پھوٹ نکلا اور ندیاں بہنے لگیں۔ کیا وہ روٹی بھی دے سکتا ہے؟ کیا وہ اپنے لوگوں کے لیے گوشت مہیا کرے گا؟ پس خداوند

سن کر غضبناک ہوا اور یعقوب کے خلاف آگ بھڑک اٹھی اور اسرائیل پر قہر ٹوٹ پڑا۔ اس لیے کہ وہ خدا پر ایمان نہ لائے اور اس کی نجات پر بھروسہ نہ کیا تو بھی اس نے افلاک کو حکم دیا اور آسمان کے دروازے کھولے اور کھانے کے لیے ان پر من برسایا اور ان کو آسمانی خوراک بخشی۔ انسانوں نے فرشتوں کی غذا کھائی۔ اس نے کھانا بھیج کر ان کو آسودہ کیا---------- باوجود ان سب باتوں کے وہ گناہ کرتے ہی رہے اور اس کے عجیب و غریب کاموں پر ایمان نہ لائے اس لیے اس نے ان کے دنوں کو بطالت سے اور ان کے سالوں کو دہشت سے تمام کر دیا---------- انھوں نے اپنے منہ سے اس کی خوشامد کی اور اپنی زبان سے اس سے جھوٹ بولا کیونکہ ان کا دل اس کے حضور درست نہ تھا اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ نکلے''۔

اللہ کا عہد و پیمان

بنی اسرائیل کی دوسری بڑی خوش فہمی جس میں مدینہ کے لوگ مبتلا تھے اور یہود کا آج تک عقیدہ چلی آ رہی ہے، یہ ہے کہ خداوند نے ان کے ساتھ عہد و پیمان کر رکھا ہے کہ وہ رہتی دنیا تک ان کو امتوں کا پیشوا بنائے گا اور انھیں ایک منتخب گروہ ہونے کا شرف ہمیشہ حاصل رہے گا۔ عہد و پیمان کی بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ دو پارٹیوں کے درمیان ہوتا ہے، یک طرفہ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس کے تحت حقوق و فرائض صرف ایک پارٹی کے لیے نہیں ہوتے بلکہ فریقین پر یکساں عائد ہوتے ہیں۔ یہود کو اس عہد کے تحت حاصل ہونے والا درجہ اور مرتبہ تو یاد رہ گیا لیکن وہ یہ بھول گئے کہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ ان ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جو عہد کے تحت ان پر عائد ہوتی ہیں۔ ورنہ یہ عہد ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔

یہود کو آگاہ کیا گیا کہ ان پر عہد کی ذمہ داری یہ تھی کہ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے پکڑیں اور زندگی میں اس سے رہنمائی حاصل کریں لیکن ہوا یہ کہ انھوں نے احکام سے بچنے کے لئے حیلے تراشے۔ وہ اپنے رسول کو سوال و جواب کے چکر میں ڈال کر احکام سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے۔ اس کی ہر بات میں مین میکھ نکالتے۔ کلام اللہ کی تحریف کرتے اور اس کو اپنے مطلب کے معنی پہناتے۔ فتوے خود لکھتے لیکن منسوب ان کو اللہ کی طرف کر دیتے۔ ان کے علماء نے عوام الناس کو دین کے اصل حقائق سے آگاہ کرنے کے بجائے دین کی ایسی غلط تصویر پیش کی کہ وہ اپنی نجات کے خواب دیکھیں اور خوش فہمیوں میں مبتلا رہیں۔ ان کو یہ عقیدہ دے دیا کہ ان کے گناہ جو کچھ بھی ہوں دوزخ کی آگ یہودی ہونے کے باعث ان کو بس چند روز ہی برداشت کرنی

ہو گی، جبکہ اس عقیدہ کی کوئی بنیاد نہیں۔ خدا نے کسی صحیفہ آسمانی میں لوگوں کو ایسی کھلی چھٹی نہیں دی اور نہ وہ اس غلط توقع کو پورا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس نے جو عقیدہ دے رکھا ہے، اور وہ سب امتوں کے لیے ہے، یہ ہے کہ کوئی شخص جب گناہ کی زندگی اختیار کرے اور وہ گناہ اس کا اوڑھنا بچھونا بن جائے تو ایسے شخص کو دوزخ میں ڈالا جائے گا اور یہ داخلہ چند روزہ نہیں بلکہ ہمیشہ کے لیے ہو گا۔

یہی نہیں بلکہ بعض خاص معاہدوں کی نشان دہی بھی کی گئی اور بتایا گیا کہ یہود ان کو پورا کرنے میں ناکام رہے۔ مثال کے طور پر ان سے عہد لیا گیا کہ وہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، والدین کے ساتھ حسن سلوک کریں گے، رشتہ داروں، یتیموں اور مسکینوں سے اچھا برتاؤ کریں گے، نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کریں گے تو انھوں نے ان احکام کی خلاف ورزی کو اپنا وطیرہ بنا لیا۔ ان سے عہد لیا گیا کہ نہ وہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کریں گے اور نہ ان کو گھروں سے نکالیں گے۔ یہود نے اس عہد سے جان چھڑانے کا طریقہ یہ نکالا کہ وہ اپنے مخالف یہود کو قتل اور ان کے گھروں کو اجاڑنے کے لیے دوسرے لوگوں کو آلۂ کار بناتے۔ جب انتقامی کارروائی مکمل ہو جاتی اور لوگ اسیر اور بے گھر ہو جاتے تو یہود ہمدردی کا مظاہرہ کرنے کے لیے اسیروں کا فدیہ دے کر ان کو آزاد کروا دیتے۔ پھر اللہ نے ان سے میثاق لے رکھا تھا کہ وہ احکام شریعت کو لوگوں کے سامنے واضح کرتے رہیں گے اور ان کو چھپانے کی کوشش نہیں کریں گے۔ لیکن ان کا وطیرہ یہ رہا کہ تورات کے حصے بخرے کر دیے اور کسی کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دیتے۔ ان کے ساتھ خاص میثاق کی ایک شق یہ تھی کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا اہتمام کرتے رہیں گے، اللہ کے رسولوں پر ایمان لائیں گے، ان کی مدد کریں گے اور دین کی جدوجہد میں مالی اعانت کریں گے۔ لیکن یہود نے اس میثاق کی ہر بات کی مخالفت کی اور میثاق کو توڑنے کے مجرم ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک میثاق خاص آخری رسول کی بابت ہوا۔ ان سے کہا گیا کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو کتاب اور حکمت دے کر سرفراز فرمایا ہے تو جب خدا کا وہ عظیم رسول تمھارے پاس آئے جس کی علامات تمھیں بتا دی گئی ہیں تو تم لوگوں کو لازماً اس رسول پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی نصرت کے لیے اٹھنا ہو گا۔ جب یہ میثاق ہوا تو بنی اسرائیل سے خاص طور پر پوچھا گیا کہ اس عہد کو پورا کرو گے اور اس کی ذمہ داری کو نبھاؤ گے تو سب نے بے کم و کاست اس کا اقرار کر لیا۔ لیکن آخری رسول کی آمد پر ان کا رویہ ڈھکا چھپا نہیں کہ وہ اس رسول کے سب سے پہلے انکار کرنے والے بنے اور اس کی مخالفت میں کبھی دریغ نہیں کرتے۔

وحی آسمانی پر ایمان

نبیوں کے بارے میں بنی اسرائیل سے جو عہد لیا گیا اس کا تقاضا یہ تھا کہ اپنی تاریخ کے ہر دور میں

یہود تمام انبیاء و مصلحین پر ایمان لاتے اور ان کے شانہ بشانہ دین کی نصرت کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے لیکن ان کی تاریخ جس بات کی گواہی دیتی تھی وہ یہ تھی کہ ہر دور میں جو لوگ دین کی دعوت لے کر اٹھے اور یہود کو ان کے مواعظ و تنقیدات پسند نہیں آئیں تو انہوں نے ایسے انبیاء و مصلحین کو قتل کر دیا- آخری دور میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر رسول ان میں مبعوث ہوئے تو یہود نے ان کے خلاف ریشہ دوانیاں کیں اور ان کو مشرک حکمرانوں کے ہاتھوں گرفتار کرانے کا باعث بنے- جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے جن کے بارے میں خصوصی میثاق ان سے لیا گیا تھا اور ان کی علامات تک سے ان کو آگاہ کیا گیا تھا، تو انہوں نے جانتے ہوئے ان کی رسالت کا انکار کیا اور مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے-

آنحضرت کی دعوت کے مقابلہ میں یہود وقتاً فوقتاً اپنا موقف بدلتے بھی رہے- ایک مرحلہ پر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے- ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارے دل ادھر ادھر کی غیر ضروری باتیں سننے کے لیے کھلتے ہی نہیں- اللہ نے ان میں گمراہی کا داخلہ بند کر رکھا ہے- اس دعویٰ پر یہ معارضہ کیا گیا کہ ایمان کی یہ کون سی قسم ہے جس میں انبیاء و مصلحین کو قتل کرنا جائز ہو، شرک کی حدود واضح ہونے کے بعد لوگ خود تراشیدہ مورتی کی پوجا کو بھی دین سمجھ کر اختیار کر لیتے ہوں، کتاب الٰہی موجود ہو لیکن علماء کی اصل دلچسپی سحر، تعویذ اور ٹونے ٹوٹکے کے ساتھ ہو- کیا کتاب اللہ پڑھنے کے بعد اس کا تقاضا تم نے یہی سمجھا کہ دنیا کی محبت تمہارے دلوں میں گھر کر گئی اور موت کا خوف تمہاری نیندیں حرام کر رہا ہے- صاحب ایمان لوگ تو موت سے ذرا نہیں کرتے لیکن تم لوگ ہو کہ موت کی آرزو کی ہمت تو کبھی کر نہیں سکتے البتہ ہزاروں سال جینے کی خواہش تمہارے دلوں میں چٹکیاں لیتی ہے-

ایک مرحلہ پر یہود کا کہنا یہ تھا کہ قرآن کے وحی آسمانی ہونے پر ہمارا دل مطمئن نہیں ہوتا- انہیں بتایا گیا کہ اس کتاب کے سوا کسی دوسری کتاب میں وہ علامتیں نہیں پائی جاتیں جن سے تمہیں تمہاری کتابوں میں آگاہ کیا جا چکا ہے- یہی واحد کتاب ہے جو ان کا صحیح مصداق بن کر آئی ہے- اہل کتاب کی ایک بڑی تعداد کا اس کو پہچان لینا اور اس پر ایمان لے آنا یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ بنی اسرائیل جانتے بوجھتے اس کی مخالفت کر رہے ہیں- جن لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ وحی آسمانی نہیں ہے تو وہ اس کی مانند ایک ہی سورہ تصنیف کر کے دکھا دیں- معلوم ہو گا کہ انسانی کاوش سے اس کا مثل تیار کرنا ممکن نہیں-

پھر یہود لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے یہ کہتے کہ قرآن کے احکام تورات کے شرعی احکام سے مختلف ہیں- اگر یہ دونوں کتابیں ایک ہی منبع سے نازل ہوئی ہوتیں اور ان کو اتارنے والا ایک ہی اللہ ہوتا تو

دونوں کتابوں میں فرق کیوں ہوتا- کیا اللہ تعالیٰ کی سوچ بدلتی رہتی ہے یا اس کے معیارات بدل جاتے ہیں- اس کا جواب رب کائنات کی جانب سے یہ آیا کہ کیا یہود کو اس بارے میں کوئی شبہ ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور کیا یہود یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور وہ کامل اختیار رکھتا ہے کہ بندوں کو کون سا حکم دے اور کون سا نہ دے- رب کائنات کی طرف سے اگر کسی حکم کو ختم کیا جاتا یا بدلا جاتا ہے تو بندوں کو اس سے بہتر اور پر حکمت حکم دیا جاتا ہے- یہود نے ماضی میں اپنی شریر طبیعت کے باعث متعدد احکام شریعت کو اپنے لیے سخت بنا لیا تھا- اب وقت آ گیا ہے کہ ان کو منسوخ کر کے فطرت انسانی کے مطابق سیدھے سادے احکام دیے جائیں تاکہ آئندہ ہر دور کا انسان ان پر عمل کرنے میں دقت محسوس نہ کرے- یہود کو قرآن تورات سے اسی لیے مختلف نظر آتا ہے-

حضرت ابراہیم سے تعلق

نبی ﷺ کی بعثت ملت ابراہیم پر ہوئی تھی جن کا پیش کردہ دین خالص توحید پر مبنی اور فطرت انسانی سے قریب تھا- وہ کائنات کی نشانیوں سے استدلال کرتے اور رب کائنات کی صفات تک رسائی پاتے- یہود کی طبیعت اس کے برعکس مشکل پسند تھی- وہ احکام میں مین میکھ نکالتے اور فقیہانہ موشگافیوں سے دین کو اپنے لیے مشکل بنا لیتے- قرآن مجید میں استدلال کی بنیادیں کائنات کے مشاہدہ اور فطرت انسانی کے ادراکات اور طبعی تقاضوں پر استوار کی گئی تھیں جو ملت ابراہیم کا معروف طریقہ تھا- بنی اسرائیل کا نسبی تعلق اگرچہ حضرت ابراہیم کے ساتھ تھا لیکن وہ حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہما السلام کے ساتھ اپنی نسبت کو زیادہ نمایاں کرتے اور اس پر فخر کرتے- نبی ﷺ کا تعلق بنی اسماعیل سے تھا جو پورے عرب میں پھیلے ہوئے تھے اور حضرت ابراہیم کو اپنا جد امجد اور رہنما تسلیم کرتے اور اس پر فخر کرتے تھے- یہود مدینہ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو یہ پروپاگنڈا شروع کر دیا کہ حضرت ابراہیم کا کوئی تعلق مکہ سے نہ تھا- وہ تو یہودی تھے اور نجات اگر ہے تو یہودی بننے ہی میں ہے- یہ بات تاریخی طور پر غلط تھی- لہٰذا یہود کو بتایا گیا کہ ان کا موقف ایک کھلا جھوٹ اور تاریخ کو مسخ کرنے کے مترادف ہے-

تاریخی طور پر حضرت ابراہیم کے پوتے اور پڑپوتے کنعان سے مصر کو منتقل ہوئے- وہاں کئی نسلیں گزر جانے کے بعد بنی اسرائیل ایک قوم بنے- ان پر قبطی قوم نے سختیاں شروع کر دیں اور ان کو غلام کا درجہ دے دیا- اسی دور غلامی میں ان کے اندر حضرت موسیٰ پیدا ہوئے جن کی تبلیغ کے نتیجہ میں بنی اسرائیل میں دین سے تعلق کچھ مضبوط ہوا اور وہ ان کو مصر سے نکال لائے- اس مرحلہ پر تورات نازل ہوئی- اس پر مزید

کئی صدیاں گزریں تو یہودیت بطور ایک مذہب معروف ہوئی- لہٰذا یہ کہنا کہ حضرت ابراہیمؑ یہودی تھے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنا تھا-

یہود اور دوسرے اہل کتاب، نیز مشرکین عرب کو حضرت ابراہیمؑ کی اصل تاریخ سے بھی آگاہ کیا گیا- یہ بتایا گیا کہ اولاً جس طرح وہ دین حنیف کے علمبردار تھے اسی طرح ان کی اولاد کم از کم پوتوں تک اس دین کے بارے میں کسی اشتباہ میں گرفتار نہ تھی اور وہ اپنی اولادوں کو وصیت کرتے تھے کہ دین فطرت میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں- ثانیاً، حضرت ابراہیمؑ کے تمام آثار مکہ میں پائے جاتے ہیں اور کہیں نہیں پائے جاتے- تمام بنی اسماعیل اور بالخصوص قریش ان کو اپنا جد امجد مانتے ہیں اور یہ عرب میں مقیم ہیں- ان کی تعمیر کردہ عبادت گاہ "خانہ کعبہ" مکہ میں موجود ہے، قربانی اور حج کی عظیم عبادات جو ان کے زمانے میں مقرر ہوئیں اسی معبد کے ساتھ وابستہ ہیں اور ان کے زمانہ سے لے کر اب تک ان پر عمل ہو رہا ہے- انہوں نے اس معبد کے حوالہ سے امن کی جو دعائیں کی تھیں وہ قبول ہوئیں اور اللہ کا یہ گھر آج بھی گہوارہ امن ہے- یہود کے کسی متبرک مقام میں حضرت ابراہیمؑ کے ایسے کوئی آثار نہیں پائے جاتے- ثالثاً، تعمیر کعبہ کے وقت حضرت ابراہیمؑ کے واحد بیٹے حضرت اسماعیلؑ ان کے ہمراہ تھے- اس موقع پر انہوں نے اپنی نسل میں ایک عظیم رسول کی بعثت کی دعا کی جو قوم کو اللہ کی آیات سنائے، ان کو احکام شریعت اور فلسفہ دین کی تعلیم دے اور ان کے اخلاق سنوارے- لہٰذا یہ دعا اصلاً اولاد اسماعیل کے اندر رسول کی بعثت کے لیے تھی جو قبول ہوئی اور محمد رسول اللہ ﷺ اسی دعا کے نتیجہ میں مبعوث ہوئے- ان کے فرائض بھی وہی ہیں جن کا تذکرہ حضرت ابراہیمؑ کی دعا میں ہے-

ان اساسات کو واضح کرنے کے بعد یہود کو دعوت دی گئی کہ وہ اگر حق کے ساتھ ذرا برابر بھی لگاؤ رکھتے ہیں تو اپنی عصبیت کے خول سے نکلیں، محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں اور تقویٰ کی راہ اختیار کریں جو اللہ کے ساتھ کیے گئے میثاق کا تقاضا ہے- اس مدلل معارضہ کا جواب، ظاہر ہے کہ، یہود کے پاس نہ تھا- وہ حسد کی آگ میں جل رہے تھے کہ رسالت کا تاج ان کو نظر انداز کر کے بنی اسماعیل کے ایک فرد کے سر پر کیوں سجا دیا گیا- چنانچہ انہوں نے نبی ﷺ کی دعوت کو ناکام بنانے کے منصوبے بنانے شروع کیے اور اس کام میں اپنے گماشتوں اور ایجنٹوں کو خوب خوب استعمال کیا- ان کی ریشہ دوانیاں کس نوع کی تھیں، اب ہم ان کا جائزہ لیتے ہیں-

(جاری ہے)

محبوب سبحانی

قیامت کی ضرورت

ابتدا ہی سے انسان کے سامنے یہ سوال رہا ہے کہ کیا اس کائنات کا کوئی مقصد ہے یا یہ محض ایک کھیل تماشا ہے جس کو اس کے خالق نے محض اپنا دل بہلانے کے لیے بنایا ہے اور جب اس کا دل بھر جائے گا تو وہ اس کھلونے کو توڑ کر دوسرا کھلونا بنا لے گا- کیا انسان جو اس کائنات کا گل سرسبد نظر آتا ہے اور اس کی نعمتوں سے متمتع ہوتا ہے شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ دنیا میں جو چاہے کرے، جتنی چاہے دھاندلی مچائے اور فتنہ و فساد برپا کرے کوئی اسے پوچھنے والا نہیں ہے اور کہیں بھی اس کا محاسبہ نہیں ہو گا- اس تصور کو کسی بھی دور میں انسانیت کے اجتماعی ضمیر نے قبول نہیں کیا حتی کہ دنیا کو دیویوں اور دیوتاؤں کی رزم گاہ سمجھنے والے یونانی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ مرنے کے بعد انسان کی روحیں ایک جگہ جمع کی جاتی ہیں جہاں ان کے دنیاوی اعمال کی بنیاد پر ان کے معیار خیر و شر کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے- دنیا کے تمام مذاہب میں بھی یہ تصور کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے کہ انسان مر کر فنا نہیں ہوتا اور مرنے کے بعد اس کے اعمال کے مطابق اس سے معاملہ کیا جاتا ہے- دنیا کو بھگوان کی لیلا کا تصور رکھنے والے ہندوؤں میں بھی تناسخ کا فلسفہ موجود ہے جس کے مطابق اگر انسان نے دنیا میں نیک کام کیے ہوتے ہیں تو وہ دوسرے جنم میں برہمن یا دوسرے اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے روپ میں جنم لیتا ہے اور اگر برے کام کیے ہوتے ہیں تو وہ گدھے یا دوسرے ادنیٰ جانوروں یا نچلی ذات کے ہندوؤں کے روپ میں دوبارہ دنیا میں آتا ہے- آسمانی مذاہب میں جزا و سزا کا تصور بڑی بنیادی اہمیت رکھتا ہے- تمام انبیاء علیہ السلام کی دعوت توحید، رسالت اور آخرت پر مبنی ہے- قرآن مجید نے آخرت کی اہمیت اور ضرورت اور آخرت کے عقلی، آفاقی اور انفسی دلائل کو بڑے واضح اور گوناگوں طور پر پیش کر کے بتایا ہے کہ دنیا کا خالق نرنکار نہیں ہے جو خیر و شر سے بے تعلق ہو کر بیٹھ گیا ہے بلکہ اس کی ایک ایک چیز پر نظر ہے اور ایک دن آئے گا جب وہ انسان کے ساتھ اس کے اعمال کے مطابق معاملہ کرے گا- جس کے اعمال نیک ہوں گے اس کو جنت میں داخل کرے گا اور برے کام کرنے والوں کو جہنم رسید کرے گا- عقل کا بھی یہی تقاضا ہے، دنیا کا مزاج بھی اسی کا متقاضی ہے، خدا کی بدیہی صفات قدرت، ربوبیت، رحمت، علم اور حکمت کا مطالبہ

بھی یہی ہے اور خدا کے قوانین اور سنن بھی یہی گواہی دیتے ہیں۔ آخرت اگر نہ ہو تو دنیا کا کوئی اخلاقی جواز باقی نہیں رہتا اور اس کی کوئی توجیہہ ممکن نہیں رہتی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اس اہم مسئلہ پر غور کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو آخرت کے مسئلہ کو اہم بنا دیتے اور اس کو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے نظام کی تکمیل کے لیے لابدی قرار دیتے ہیں۔

کائنات کا وجود باحکمت ہے

قیامت کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اس کی ضرورت کیا ہے، اس کا آنا کیوں ضروری ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ قیامت اور جزا و سزا نہیں ہے، یہ دنیا ایک دن اچانک ختم ہو جائے گی یا اسی طرح ہمیشہ چلتی رہے گی اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہو گی تو اس میں کیا قباحت ہے؟ اگر قیامت نہیں ہے تو کیا اس دنیا کی کوئی عقلی و اخلاقی توجیہہ ممکن ہے؟ کیا اس کے وجود کو جائز اور معقول ثابت کیا جا سکتا ہے؟ کیا اس کا باقی رہنا کسی پہلو سے بھی ایسی چیز ہے کہ جس کو کوئی عاقل گوارا کر سکے۔ کیا دنیا میں شر اسی طرح غالب رہے گا؟ کیا مظلوم برابر ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے اور غریب امیروں کے استحصال کا شکار ہوتے رہیں گے؟

ان سوالات کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ اس کارخانہ کائنات پر غور کیا جائے۔ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی کباڑیے کا گودام یا بازیچۂ اطفال نہیں ہے کیونکہ زمین و آسمان اور پوری کائنات میں اہتمام اور انصرام نظر آتا ہے، اس میں ایک ڈسپلن موجود ہے، اس کا ایک قرینہ ہے، بے نظیر ترتیب و انتظام ہے، بے مثال اقلیدس و ریاضی ہے۔ سورج معین نظام الاوقات کے ساتھ نکلتا اور تابانیوں سے سارے جہان کو روشن کرتا ہے۔ اس کے فیض سے سردی، گرمی، خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہوتے ہیں جن میں سے ہر ایک ہماری دنیا کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اس سے کسب نور کر کے معین منزلیں طے کرتا، ہماری تاریک راتوں میں مختلف زاویوں سے ہمارے لیے شمع برداری کرتا اور ہمارے سالوں اور مہینوں کی تقویم بناتا ہے۔ زمین انسان کے لیے گہوارہ بنی ہوئی ہے۔ وہ اس میں رہتا بستا ہے۔ اس میں سے اس کے لیے رزق کا سامان پیدا ہوتا ہے۔ انواع و اقسام کے کھانے پینے کی اشیاء پیدا ہوتی ہیں جو جسم و جان کی ضروریات کو پورا کرتی، انسانی قوتوں اور صلاحیتوں کو نشو و نما دیتی اور ہر ذوق کی تسکین کرتی ہیں۔ اس میں باغ و چمن لہلہاتے ہیں۔ ان کے پھولوں کی رنگت اور خوشبو الگ ہوتی ہے جو ہماری باصرہ

نوازی اور قوت شامہ کی تسکین کا سامان کرتی ہے۔ زمین پر ان گنت قسم کی روئیدگی ہوتی ہے جو انسان کی ہر نوع کی ضروریات پوری کرتی ہے۔ اس کے لیے آسمان سے بارش ہوتی ہے جو اگر نہ ہو تو زمین خشک و بنجر ہو جائے، سامان زیست ختم ہو جائے اور انسان زندہ نہ رہ سکے۔ اسی طرح زمین کے اندر خزانے دفن ہیں جن کو انسان نکال کر اپنی معاشی ضروریات اور ترقی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ انسان زمین پر گھر بنا کر رہتا ہے۔ پھر مرنے کے بعد اسی کے اندر دفن ہو جاتا ہے۔ زمین پر چلنے پھرنے والے لاکھوں اقسام کے جانوروں اور فضا میں اڑنے والے پرندوں پر اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ ان کی زندگی کو بھی ایک ضابطہ میں باندھ دیا گیا ہے۔ ان کی جو فطرت بنائی گئی ہے اس سے یہ بالکل انحراف نہیں کرتے۔ شیر بھوکا مر جائے گا لیکن گھاس نہیں کھائے گا۔ ان کو جس ڈگر پر ہانک دیا گیا ہے اس پر یہ چل رہے ہیں۔ سمندر کے عجائب اتنے ہیں جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتے۔ اس میں سے انسانوں کے لیے رزق اور زیب و زینت کی چیزیں نکلتی ہیں۔ اس پر سینکڑوں ٹن وزنی جہاز چلتے ہیں جن کے ذریعہ سے انسان سفر کرتا اور سامان ایک ملک سے دوسرے ملک میں پہنچاتا ہے۔

یہ اس کائنات کے بڑے بڑے حقائق ہیں جو اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ اس کا خالق عظیم قدرت رکھتا ہے، اس کے ہر کام میں عظیم حکمت پوشیدہ ہے، اس نے انسان، جو کائنات کا دولہا ہے، کے ہر مطالبہ کا بہتر سے بہتر جواب دیا ہے جس سے اس کی عظیم ربوبیت اور رحمت ظاہر ہوتی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب کائنات کی ہر چیز کا مقصد اور اس کی حکمت بڑی واضح نظر آتی ہے تو پھر پوری کائنات کا مقصد کیا ہے؟ یہ پوری کائنات بے مقصد اور بے غایت کیسے ہو سکتی ہے کہ نتیجہ تک پہنچے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی ختم ہو جائے؟ اگر یہ مان لیا جائے تو قدرت و حکمت، ربوبیت اور رحمت کی ساری شانیں جو اس کائنات کے ہر گوشہ میں جلوہ گر ہیں وہ سب بے مقصد اور بے غایت قرار پاتی ہیں جبکہ ہمارے مشاہدہ کی رو سے کائنات کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کا وجود بھی بے معنی نہیں ہے۔ کچھ اینٹیں ایک جگہ بکھری ہوئی پڑی ہوں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یوں ہی پڑی ہوئی ہیں لیکن اگر کوئی شخص یہی بات تاج محل، لال قلعہ یا بادشاہی مسجد کے متعلق کہے تو کیا کوئی سلیم العقل اور مستقیم الفطرت انسان ایک لمحہ کے لیے یہ باور کر سکتا ہے کہ یہ بے مقصد اور بے غایت عمارات ہیں۔ قرآن مجید میں اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا ہے۔

ما خلقنا السموت والارض وما بينهما الا بالحق و اجل مسمی -(الاحقاف-۳)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزوں کو نہیں پیدا کیا مگر ایک غایت اور معین مدت کے لیے-

اس کائنات کے اہتمام وانصرام کا لازمی تقاضا ہے کہ مانا جائے کہ نہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ ہے نہ یہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے، بلکہ یہ نہایت اہتمام سے پیدا کیا ہوا ایک باغایت وبامقصد کارخانہ ہے-

اب دیکھنا چاہیے کہ اس کائنات کے حوالے سے انسان کا مقام اور اس کی غایت کیا ہے-

انسان کا مقصد تخلیق

اس دور کے فلسفی انسان کی حیثیت کی توجیہ یوں کرتے ہیں کہ انسان خود مقصود بالذات ہے یعنی خود اپنی ذات میں مطلوب ہے-یہ کسی کے لیے نہیں پیدا ہوا بلکہ یہ خود اپنی شریعت کا مصنف، دینی تہذیب و ثقافت کا موجد اور اپنے قانون کا بانی ہے-اس نے جن چیزوں کو برا کہہ دیا ہے وہ بری ہیں-اگر کل وہ ان ہی چیزوں کو اچھا کہہ دے تو وہی اچھی ہو جائیں گی-

نئے فلسفیوں کی یہ توجیہ درست نہیں ہو سکتی کیونکہ انسان ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے لیکن اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ وہ مخلوق ہے-جب وہ مخلوق ہے تو بہر حال وہ اپنے خالق کی مرضی اور اس کے حکم کے تابع ہے-خالق کے اقتدار اعلیٰ سے انسان کے لیے کوئی مفر نہیں لہٰذا انسان کسی طرح مقصود بالذات نہیں ہو سکتا-مقصود بالذات تو صرف خدا ہی ہو سکتا ہے کیونکہ وہ ہر چیز کا خالق اور قائم بالذات ہے-وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں-انسان اس کائنات کا گل سر سبد ہے تو لازماً یہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے-

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی کسی احتیاج کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ ہر حال میں ان کی نازبرداری کرتا رہے-اس کی سلطنت اپنے بل بوتے پر قائم ہے-اس نے انسان کو پیدا کیا ہے تو اس کا سبب اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے،اس کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت کو سمجھے اور اپنے مقصد تخلیق کو جان کر اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے-

جب یہ معلوم ہے کہ انسان خالق نہیں مخلوق ہے، آقا نہیں غلام ہے، رزق دینے والا نہیں بلکہ

رزق پانے والا ہے، حاکم نہیں محکوم ہے، تو ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کا مقصد اس کا مالک و آقا ہی متعین کرے گا-یہ مقصد زندگی اللہ تعالیٰ نے مبہم نہیں چھوڑا بلکہ ہمیشہ سے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے اس کو اجاگر فرمایا-چنانچہ قرآن مجید میں واضح کیا کہ

وما خلقتُ الجِنَّ والانسَ الّا ليعبُدُون- ما اُرِيدُ منهُم رزقٍ وَمَا اُرِيدُ ان يُطعِمُون انَّ اللّهَ هُوَ الرَّزّاقُ ذوالقوّة المتين (الذاريات: (۵۸-۵۶)	میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں-نہ میں ان سے چاہتا ہوں کہ وہ رزق کا سامان کریں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں-بلاشبہ اللہ ہی روزی رساں، زور آور، قوت والا ہے-

اس سے معلوم ہوا کہ خالق کائنات چاہتا ہے کہ انسان اس کی عبادت واطاعت کا حق ادا کر کے سعادت و کمال کی معراج حاصل کرے-اگرچہ انسان کی تخلیق کا یہ مقصد متعین ہو چکا ہے لیکن ہمیں دنیا میں کوئی ایسا انتظام نظر نہیں آتا جس میں خدا یہ جانچ کرتا ہو کہ کس شخص نے اپنے مقصد تخلیق کو پورا کیا اور کس نے اس سے بے پروائی برتی-اس دنیا میں تو وہ لوگ بھی پوری طرح آزاد ہیں جو خدا کی بندگی واطاعت کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں بلکہ وہ دوسروں کی نسبت زیادہ آزادی سے رہتے نظر آتے ہیں-لہٰذا ایک ایسے دن کا آنا ضروری ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ یہ دیکھے کہ کس بندے نے اپنے مقصد تخلیق کو پورا کرتے ہوئے خدا کی اطاعت میں زندگی گزاری اور کس نے اس کی نافرمانی کی، اور ان کی اطاعت یا نافرمانی کے لیے جزا اور سزا کا اہتمام کرے-چنانچہ سورہ الدخان میں فرمایا:

و ما خلقنا السموات والارض وما بينهما لعبين ما خلقنا هما الا بالحق ولكن اكثرهم لا يعلمون ان يوم الفصل ميقاتهم اجمعين (الدخان: ۴۰-۳۸)	اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل کے طور پر نہیں بنائیں- ہم نے ان کو نہیں پیدا کیا ہے مگر ایک غایت کے ساتھ لیکن ان کے اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے-بیشک فیصلہ کا دن ان سب کا وقت موعود ہے-

مطلب یہ ہے کہ آسمان اور زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں کھیل تماشا کے لیے نہیں بنائی گئیں بلکہ ہر ایک بہ تر غایت اور ایک مقصد حق کے ساتھ پیدا کی گئی ہے- اس کائنات کے بالحق ہونے کا تقاضا ہے کہ یہ دنیا یوں ہی نہ چلتی رہے اور یوں ہی نہ تمام ہو جائے بلکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا دن آئے جس دن خدا عدل کی کرسی پر بیٹھے اور ہر ایک کے معاملات کا فیصلہ کرے- جنہوں نے حق و راستی کی زندگی بسر کی ہو وہ اس کا صلہ پائیں اور جنہوں نے ظلم و تعدی کا ارتکاب کیا ہو وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں- اور وہ دن عدل کامل کے ظہور کا دن ہو کہ کوئی بھی اس سے نہ بچ سکے- چھوٹے اور بڑے، امیر اور مامور، شاہ اور گدا سب سے انصاف ہو اور ایسا انصاف ہو کہ نہ کوئی حقیقت مخفی رہ جائے اور نہ کوئی کسی پہلو سے انصاف میں مزاحم ہو سکے-

انسان کے بارے میں ایک اٹل حقیقت یہ ہے کہ اس کو موت آتی ہے جس سے کسی کو بھی مفر نہیں- اب اگر انسان کی زندگی کا ایک مقصد معین ہے تو اس کی موت کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہیے- یہ مقصد اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قیامت تک سب انسانوں کو جمع کیا جائے اور پھر مقصد زندگی پورا کرنے والوں کو خیر اور اس سے انحراف کرنے والوں کو سزا دی جائے-

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ آدمی نہ اپنے برے اعمال کے اثرات و نتائج سے کماحقہ آگاہ ہو سکتا ہے، نہ اچھے اعمال کے صلہ کی قدر و قیمت ہی سے- یہ دنیا چند روزہ ہے اور جزا و سزا کا تعلق ایک ایسی دنیا سے ہے جس کی سزا بھی ابدی ہے اور جزا بھی ابدی- ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ روز جزا اس لیے مقرر فرمایا ہے کہ اس کے جو بندے ایمان و عمل کی روش اختیار کریں ان کو وہ ان کے اعمال کے تاریک تر پہلو کے الزامات سے بچائے اور ان کے اعمال کا جو سب سے اعلیٰ پہلو ہے اس کی برکتوں سے نوازے- گویا اس میں یہ رہنمائی دی گئی ہے کہ آدمی اپنے عمل کے صرف فوری اثرات و نتائج ہی پر نگاہ نہ رکھے بلکہ ان اثرات و نتائج پر نگاہ رکھے جو ایک ابدی زندگی میں ان پر مترتب ہونے والے ہیں-

(جاری ہے)

پروفیسر عبدالخالق فاروقی

تصانیف مولانا اصلاحیؒ
-۲-

۹- حقیقت شرک و توحید

عام طور پر متکلمین نے دین کے بنیادی عقائد و مسائل پر جس نہج سے بحث کی ہے وہ یونانی منطق کے فرسودہ طریق استدلال سے ماخوذ ہے جس کے اندر عقل و فطرت کے لیے کوئی اپیل نہیں ہے- ماضی قریب میں علامہ حمید الدین فراہیؒ نے حکمت قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن کے طریقہ استدلال کو واضح کیا- انہی کے تتبع میں ان کے شاگرد مولانا اصلاحیؒ نے ایک شاہکار کتاب "حقیقت شرک و توحید" لکھی- دو حصوں میں منقسم یہ کتاب ۳۱۱ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے- قرآنی علم کلام، قرآنی فکر و فلسفہ، قرآنی استدلال اور قرآنی حکمت و بصیرت کا ایک لازوال خزانہ اس کتاب کے اندر جمع کر دیا گیا ہے- مولانا نے اس کتاب میں قرآن کی عقلیت کو آشکار کیا ہے اور عصر حاضر کے فکر و فلسفہ نے نئی نسل کے ذہنوں میں جو زہر پھیلائے ہیں ان کا تریاق فراہم کیا ہے-

یہ کتاب اسلام کے اساسی کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شرح ہے- اس کے حصہ اول "حقیقت شرک" میں لا الہ اور حصہ دوم "حقیقت توحید" میں الا اللہ کی وضاحت کی ہے- حصہ اول میں شرک کی حقیقت اور اس کی اقسام بیان کی گئی ہیں- مشرکین عرب، اہل کتاب اور منافقین کے شرک کی موزوں ترتیب کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے جس سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ لا الہ کی نفی اور الا اللہ کا اثبات زبان سے ادا کرنے کے لیے نہایت سہل اور مختصر ہے لیکن اس کے مقتضیات و لوازم کا مظاہرہ جب عملی زندگی میں ہوتا ہے تو انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ جاتا-

"موجودہ دنیا کا سرسری جائزہ" کے عنوان کے تحت مولانا نے بتایا ہے کہ مشرق بعید، ہندوستان، مغربی یورپ، امریکہ اور روس ہر جگہ شرک کی کیسی گھنونی اور مکروہ شکلیں پائی جاتی ہیں اور علم و تحقیق کے مدعیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ اب شرک دنیا سے ناپید ہو چکا ہے وہ کیسی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ پورے کرہ ارض پر چھایا ہوا ہے- پھر مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ لے کر بتایا ہے کہ توحید کے مدعی کس کس شکل میں شرک کی گندگی سے آلودہ ہیں-

مولانا نے قرآنی دلائل سے یہ واضح کیا ہے کہ شرک انسانی فطرت کے منافی ہے۔ انسان کی فطرت کے اندر ایک منعم حقیقی کی محبت اور اس کے حمد و شکر کا جذبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ شرک کا اصل سبب انسان کی دناءت، پست ہمتی، نفع عاجل کی محبت اور فوری لذت کے حصول کی طلب ہے۔

حصہ دوم میں توحید کا اثبات قرآنی استدلال سے کیا گیا ہے جس کی اساس فطرت اور کائنات کی آیات پر ہے جن کی حجت عربی و عجمی اور عامی و فلسفی سب کے لیے یکساں ہے۔ متکلمین و فلاسفہ کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علت العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ حل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ خلا بھرتا ہے جس کو ہر انسان اپنے اندر شدید طور پر محسوس کرتا ہے۔ قرآنی استدلال سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے۔ جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور لاشریک ہے اسی طرح صفات کے لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے اور اسی کے حکم کی پیروی کی جائے۔ جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکر گزاری اور حقیقی محبت کا مرکز اسی کو ماننا چاہیے۔ جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے۔ جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کا اتباع کیا جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ ان تمام باتوں سے اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے یا ان میں دوسروں کی حصہ داری ثابت ہو۔

یہ کتاب اپنے موضوع پر رفعت فکر اور استدلال کے اعتبار سے درجہ کمال پر پہنچی ہوئی اور بے مثل شان کی حامل ہے۔ اس موضوع پر دور حاضر میں بہت کچھ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ مولانا کا اسلوب، استدلال اور ترتیب و مواد سب سے جدا اور ممیز ہے۔

۱۰- تزکیہ نفس

تزکیہ نفس کا موضوع ہمیشہ سے ارباب تصوف کی دلچسپی کا محور رہا ہے۔ مولانا اصلاحی نے مروجہ تصوف کو بے رحم تنقید کا نشانہ بنایا اور تصوف کے مروجہ طریقہ اور انداز سے ہٹ کر خالص قرآنی فلسفہ کی روشنی میں تزکیہ نفس کا وہ نقشہ پیش کیا جو نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو دیا تھا۔ صوفیاء کا تزکیہ نفس انفرادی نوعیت کا ہوتا ہے اور وہ بھی زندگی کے محدود دائروں میں، لیکن مولانا اصلاحی نے اپنی بے مثل کتاب تزکیہ نفس کے موضوع کو زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلا دیا ہے۔

تزکیہ نفس دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد تزکیہ علم اور تزکیہ عمل کے مباحث پر مشتمل ہے اور دوسری جلد کا عنوان تزکیہ تعلقات ہے۔ مولانا نے خود اس کتاب سے متعلق فرمایا ہے کہ یہ ان کے عمر بھر کے مطالعہ کا حاصل ہے۔ اور اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔ اس کتاب کی اہمیت مولانا اصلاحی کے اس نظریہ سے واضح ہوتی ہے کہ بعثت انبیاء کا مقصود حقیقی تزکیہ نفس ہے اور انسان کی دینی و دنیوی فوز و فلاح تزکیہ نفس سے وابستہ ہے۔ مولانا نے یہ نظریہ قرآن سے اخذ کیا ہے اور لکھا ہے کہ تزکیہ کا جو مفہوم انہیں کتاب و سنت کے مطالعہ، اسوۂ رسول اور صحابہ کرام کی پاکیزہ اور مثالی زندگیوں میں نظر آیا اسے انہوں نے بے کم و کاست اپنی اس تصنیف میں پیش کر دیا ہے۔ جلد اول کے مضامین کے مطابق اس نظام تزکیہ میں سب سے پہلے عقیدہ و علم کی اصلاح ہوتی ہے۔ پھر عمل کی اصلاح و تربیت کے لیے اسوۂ رسول کا ایک جامع نقشہ صحیح ترین روایات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ یوں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج محض خالی رسوم ہونے کے بجائے گہری حکمت پر مبنی اور مخصوص مقاصد تربیت کی حامل عبادات بن جاتی ہیں۔ فرد کو جس معاشرے میں زندگی بسر کرنا ہے اس کی مختلف حیثیتوں کے پیش نظر اسے واضح اور قابل عمل احکام دیے جاتے ہیں۔ ان احکامات کے ذریعے اس کا تعلق بیک وقت خالق اور مخلوق کے ساتھ جڑتا ہے جس سے تزکیہ نفس کا عمل انفرادی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی شان اختیار کرتا ہے اور یہی کتاب و سنت کا مقصود ہے۔

تزکیہ نفس جلد دوم کے مضامین اٹھارہ ابواب میں ۲۱۷ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ پہلا باب ایمان اور اسلام سے متعلق ہے۔ ایمان کا تعلق عقائد سے اور اسلام کا تعلق اعمال سے ہے۔ دوسرے باب میں تعلق باللہ اور اس کی اساسات سے بحث کی گئی ہے۔ جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو خدا کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنانا چاہیے۔ صوفیا کی زبان میں خدا کی صفات کا مظہر بنانا دین و شریعت میں مطلوب نہیں۔ بعد کے گیارہ ابواب میں خدا کے ساتھ بندے کے تعلق اور ایمان کے لوازم کی تشریح ہے۔ ایمان کے لوازم میں شکر، عبادت، اطاعت، اخلاص، محبت، خوف، حیا، وفا، حمیت، حمایت اور جہاد کی نوعیت کو آیات قرآنی اور احادیث مبارکہ کے حوالے سے سمجھانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے آخری چھ ابواب میں مختلف سطحوں پر انسان کے تعلقات کی نوعیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ انسان کا سب سے گہرا تعلق خود اپنے نفس کے ساتھ ہے۔ نفس کے حقوق میں معرفت حق، تربیت نفس، عزت نفس اور احتساب نفس کی بحث کو نہایت عمدہ اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر آدمی کا تعلق اس کے کنبے، خاندان، معاشرہ، ریاست، والدین، بیوی، بچوں،

غرباء، یتامی اور پڑوسیوں کے ساتھ واضح کیا گیا ہے۔ان عنوانات کے تحت کتاب و سنت کی تعلیمات کا نچوڑ سامنے لایا گیا ہے۔کتاب کے آخری دو ابواب میں انسان کے معاشرہ اور ریاست کے ساتھ تعلقات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ پھر معاشرتی تعلقات کے سہ گانہ مراحل دعوت، ہجرت اور جہاد کی نوعیت، مقام اور ضرورت پر بحث کی گئی ہے۔ریاست کے ساتھ ایک مسلمان فرد کا تعلق کیا اور کیسا ہونا چاہیے اس کی چار مثالیں دے کر دینی احکام کو واضح کیا گیا ہے۔یوں تزکیہ تعلقات میں خدا کی ذات سے لے کر معاشرے اور ریاست میں جتنے اور جیسے بھی شعبے یا دائرے ہو سکتے ہیں ان سب کے ساتھ تعلقات کی اسلامی نہج کیا اور کیسی ہونی چاہیے ان کی ایک جامع تفصیل اس کتاب کا امتیاز ہے۔

الغرض مولانا کی یہ کتاب سارے اسلامی لٹریچر میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ملت اسلامیہ کے دوش پر مولانا اصلاحی کا یہ ایک ایسا احسان ہے جس کے بارے وہ کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔

۱۱۔ مبادی تدبر قرآن

اس عہد کے عظیم مفسر قرآن علامہ حمید الدین فراہی نے کامل چالیس برس تک قرآن مجید میں غور و تدبر کیا اور اپنے نتائج فکر کو اپنی مختلف کتابوں میں مرتب کیا۔انھوں نے قرآن فہمی کے محکم اصول متعین کیے۔امام فراہی کے نزدیک قرآن حکیم ایک منظم کلام ہے۔اس کا خزانہ حکمت نظم کے اندر پوشیدہ ہے۔لہذا نظم کلام کو سمجھے بغیر صحیح تفسیر تک رہنمائی نہیں ہوتی۔ قرآن فہمی کے لیے نزول قرآن کے زمانہ کی زبان میں مہارت بہم پہنچانی ضروری ہے۔ قرآن کی تفسیر قرآن ہی کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔ ہر سورہ کا ایک عمود یا مرکزی مضمون ہوتا ہے اور سورہ کے جملہ مضامین اسی عمود کے گرد گھومتے ہیں۔کلام میں معروف معانی اور اسلوب کو ملحوظ رکھا جائے اور شاذ معانی اور غیر معروف اسلوب اختیار نہ کیا جائے۔ ضمنی مآخذ سے استفادہ کیا جائے لیکن قرآن کے توابع کی حیثیت سے۔ قرآن کو اصل، اساس اور کسوٹی بنایا جائے۔وغیرہ

مولانا امین احسن اصلاحی نے علامہ فراہیؒ کی خدمت میں پانچ برس گزار کر ان کی رہنمائی میں قرآن پر تدبر کرنے کے یہ اصول سیکھے اور پھر انہی اصولوں کی روشنی میں قرآن میں غور و تفکر کو اپنی زندگی کا منتہائے مقصود بنایا۔ان اصولوں کو وسیع موضوعات میں پھیلا کر فکر فراہی کو بلند پروازی عطا کی ہے۔ نیز ان اصولوں کو انھوں نے اپنی زبان اور اپنے اسلوب میں بھی بیان کیا ہے اور اس کے لیے ایک مستقل کتاب تصنیف کی ہے جس کا نام مبادی تدبر قرآن ہے۔اس میں تدبر قرآن کے وہ اصول بیان کیے گئے ہیں جو مولانا کے نزدیک

قرآن فہمی کے لیے شاہ کلید کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مولانا نے پہلے وہ شرائط بیان کی ہیں جن کے بغیر قرآن فہمی کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ان شرائط کا تعلق ارادہ اور نیت کی درستی اور غایت و مقصد کی پاکی و طہارت سے ہے۔اس کے بعد مولانا نے قرآن فہمی کے داخلی وسائل پر بحث کی ہے۔انھوں نے اس بات کی تردید کی ہے کہ قرآن کریم ایک سپاٹ کتاب ہے جس کو سمجھنے کے لیے کسی کاوش اور عمیق مطالعہ کی ضرورت نہیں۔اس ضمن میں مولانا کا موقف یہ ہے کہ عام تعلیم کے لحاظ سے قرآن آسان کتاب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عمیق فلسفہ، احکام و قوانین اور گہری حکمت بھی ہے جس کو سمجھنے کے لیے سرسری طور سے گزر جانا کافی نہیں ہے، بلکہ اس پر ٹھہر کر تدبر کرنا چاہیے۔

قرآن مجید کی تفسیر میں اصل الاصول خود قرآن کے الفاظ، اس کے شواہد و نظائر، کلام کا سیاق و سباق اور اس کے نظم کا لحاظ ہے۔ تاہم روایات و آثار کی رہنمائی سے وہاں فائدہ اٹھانا بھی ضروری ہے جہاں قرآن کے الفاظ اشارہ کر رہے ہوتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ مولانا نے محدثین، متکلمین، مقلدین اور متجددین کے طریقہ ہائے تفسیر بیان کر کے ان پر تنقید کی ہے اور ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے اور ساتھ ہی مولانا فراہی کے اصول تفسیر بیان کر کے ان پر طویل علمی بحث کی ہے۔

۱۲۔ تدبر قرآن

تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی کی عظیم الشان اور معرکۃ الآراء تفسیر ہے جو نو جلدوں میں ہے۔ یہ کتاب ان کے عمر بھر کے مطالعہ اور غور و فکر کا نچوڑ ہے۔بلاشبہ اردو زبان کو اس پر فخر حاصل ہے کہ اس کا دامن تدبر قرآن کے موتیوں سے مزین ہے۔اس تفسیر کے لیے مولانا نے اس وقت تیاری شروع کر دی تھی جب وہ امام فراہی سے فکر قرآن اور حکمت قرآن کے موتی چن رہے تھے۔ لیکن خدا کی شان ہے کہ مولانا کی باقاعدہ تصانیف میں اس کا نمبر آخر میں آیا۔ تفسیر لکھنا شروع کرنے سے پہلے مولانا انقلاب زمانہ کی کئی کروٹیں اور حیات مستعار کے کئی نشیب و فراز دیکھ چکے تھے۔

مولانا جنوری ۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی سے مستعفی ہوئے تو اس کے بعد یہ تفسیر لکھنا شروع کی اور ۱۹۸۰ء میں قلم کا یہ مسافر ۲۳ سال کی طویل مسافت طے کرنے کے بعد منزل مقصود پر پہنچا۔ تفسیر لکھتے ہوئے مولانا خود فرماتے ہیں کہ انھوں نے گہری اور عمیق لذت کا احساس کیا ہے اور کبھی تکان اور افسردگی

محسوس نہیں کی۔ اس میں جو لکھا ہے وہ خوب سوچ کر اور تدبر و غور کر کے لکھا ہے۔ مولانا کے بقول اس کی خاطر انہوں نے ہر وہ پتھر الٹا جس کے نیچے اس کی مدد کے لیے کوئی چیز نظر آتی تھی۔ یہ تفسیر درحقیقت ایک صدی کے فکر کا نچوڑ ہے۔ اس میں ان کے استاذ امام فراہیؒ کا فکر بھی شامل ہے۔ امام فراہیؒ نے عمر بھر قرآن کے متعلق جو کچھ سوچا وہ اس میں سمو دیا گیا ہے۔ یہ تفسیر تیزی سے اصحاب فکر و علم کی توجہ کا مرکز بنتی جا رہی ہے۔ آنے والے زمانہ میں قرآنیات کا کوئی بھی طالب علم اس سے مستغنی نہیں ہو سکے گا۔

اس تفسیر میں مولانا اصلاحی نے اپنے استاد کے تجویز کردہ اصول تفسیر کو رہنما بنایا ہے۔ اس میں تفسیر آیات بالآیات کا التزام ہے۔ قرآن مجید کو ایک مربوط کلام کے طور پر سمجھا گیا ہے اور تاویلات کی کثرت سے اجتناب کیا گیا ہے۔ مولانا نے نظم قرآن کی بعض نئی جہتیں دریافت کی ہیں۔ ان کے نزدیک قرآن کی تمام سورتیں جوڑا جوڑا ہیں اور جوڑے میں ایک مضمون کی تکمیل کرتی ہیں۔ ہر سورۃ کا عمود متعین کیا گیا ہے اور قرآن کی تمام سورتوں کو سات گروپوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ مولانا کے نزدیک ان سات گروپوں کا اپنا اپنا خاص عمود ہے۔ یہ مولانا کی تفسیر کی ایک ایسی ممتاز خصوصیت ہے جس کی نظیر اس سے پہلے نہیں ملتی۔ اختلافی مقامات پر قرآنی نظائر کو ترجیح دی گئی ہے اور قرآنی نظائر سے جو مفہوم قریب ترین ہے اس کو بیان کیا گیا ہے۔ جہاں قرآنی اشارات متقاضی ہیں روایات و آثار سے بھی استدلال کیا گیا ہے۔ نحوی اختلافات میں قرآن کے اسالیب کو اساس قرار دیا گیا ہے۔ فقہی مسائل میں ترجیح کا مسلک اختیار کیا گیا ہے۔ پورے فقہ اسلامی کو مدنظر رکھ کر وہ اقوال فقہیات میں راجح قرار دیے گئے ہیں جو اقرب الی الکتاب والسنۃ ہیں۔ بعض مسائل میں مولانا کی فقہی بصیرت اور اجتہادی صلاحیت کا بھی پتہ چلتا ہے۔ موقع و محل کی مناسبت سے عصر حاضر کے گمراہ کن فلسفہ و فکر کا محاکمہ اور قرآنی دلائل کی روشنی میں ان کا رد کیا گیا ہے۔ اسلاف کے اقوال کو دلائل کے ساتھ قبول اور دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ مولانا نے جوبات لکھی ہے وہ پوری قطعیت اور اطمینان قلب کے ساتھ لکھی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مفسر کو اپنی تحقیق پر پورا یقین ہے۔

مولانا نے تفسیر میں آسمانی تعلیمات کو اردو زبان کا ایک نیا قالب دیا ہے۔ جو شخص اردو ادب کا اعلیٰ پائے کا ذوق رکھتا ہے، وہ تفسیر کی ادبی چاشنی سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ قرآن کی تمثیلوں، تشبیہات اور استعاروں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جس ہنر کی ضرورت تھی، خود اس پر بھی قرآنی رنگ اثر انداز ہوا ہے۔ تفسیر میں دعوت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ تفسیر کا مطالعہ کرنے سے دینی دعوت کا ذوق ابھرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت نصیب ہوتی ہے۔ ایمان کی حلاوت ملتی ہے۔ محبت الٰہی پیدا ہوتی ہے۔ انبیاءؑ اور صحابہؓ کی پاکیزہ زندگیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔

غرض اس میں وہ سب کچھ ہے جو ایک مکمل تفسیر میں ہونا چاہیے۔ بعض معاملات میں مولانا نے منفرد رائے بھی اختیار کی ہے لیکن انہوں نے جو رائے قائم کی ہے وہ خوب سوچ کر قائم کی ہے اور اس پر دلائل دیے ہیں۔ مولانا کی رائے کا رد کرنا کوئی سہل بازی نہیں ہے۔ مولانا اصلاحیؒ کو اپنے استاد امام فراہیؒ سے والہانہ محبت ہے۔ انہی کے فکر کو عمر بھر اوڑھنا بچھونا بنایا ہے۔ تفسیر تدبر قرآن میں بھی انہی کے سُر میں سُر ملانے کی سعی کی ہے لیکن محبت کے باوجود بعض آراء میں ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مولانا اپنے استاد کے اندھے مقلد نہیں تھے۔ اور یہی چیز عالم ربانی کے شایان شان ہے۔

الغرض تفسیر تدبر قرآن گوناگوں خوبیوں کی جامع ہے۔ علم و حکمت کا بحر ناپیدا کنار ہے۔ اس کے مطالعہ سے خود انسان کے اندر قرآن پر مزید غور و تدبر کرنے کا ذوق اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مفسر کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

۱۳۔ توضیحات

مولانا اصلاحیؒ کی یہ کتاب ان مضامین کا ایک منتخب مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً کسی سوال کے جواب یا کسی اعتراض کی تردید یا کسی الجھن کو صاف کرنے کے لیے لکھے ہیں۔ ان میں بعض مضامین قرآن مجید سے متعلق ہیں، بعض حدیث و سنت سے متعلق ہیں اور بیشتر ایسے ہیں جن میں کسی فقہی، علمی یا معاشرتی و اجتماعی یا تمدنی و سیاسی مسئلہ سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مسائل زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریک اسلامی اور نظام اسلامی کے قیام سے تعلق رکھتے ہیں۔

قرآنیات میں سات مسائل پر بحث ہے۔ قرآن مجید کی سورتوں کے ناموں کی توجیہ، سورہ نساء کی ایک آیت کی تاویل، ہاروت و ماروت کے نزول کا مقصد و فلسفہ، سورہ فرقان کی ایک آیت واجعلنا للمتقین اماما کی توضیح، بنی اسرائیل میں ملوک کی حیثیت، سورہ ہود کی ایک آیت سے گمراہ فرقوں کا غلط استدلال اور اس کی صحیح توجیہ و تاویل، ختم قلوب کا مفہوم۔ ان سب موضوعات پر مولانا نے انتہائی باوقار عالمانہ انداز میں بحث کی ہے جو ان کے ذوق قرآن اور تدبر فی قرآن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ مباحث زیادہ تر ماہنامہ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) سے لیے گئے ہیں جو مولانا اصلاحی کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا۔ یہ

رسالہ ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۹ء تک جاری رہا پھر وجود علم کا یہ سوتا بند ہو گیا۔

کتاب کا دوسرا باب حدیث سے متعلق مسائل پر مشتمل ہے۔اس باب کے مباحث مولانا کی محدثانہ بصیرت اور حدیث پر گہری نظر کے آئینہ دار ہیں۔ حدیث اور سنت کا فرق واضح کیا گیا ہے، سنت کے معلوم کرنے کے ذرائع بیان کیے گئے ہیں اور اخبار احاد کا مفہوم، دین میں ان کا مقام اور ان کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نیز احادیث سے فائدہ اٹھانے کا صحیح طریق بتایا گیا ہے۔ محدثین کے کارہائے نمایاں اور ان کی کاوش و تحقیق کے اعترافات کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ان کا کام تنقید سے بالاتر نہیں ہے۔ ضمناً جماعت اسلامی اور اس کے اس وقت کے امیر مولانا مودودیؒ کی حدیث سے متعلق پالیسی اور نقطہ نظر کی وضاحت کی گئی ہے۔ انبیاء سابقین، صحابہ اور ائمہ مجتہدین پر تنقید کا مفہوم بیان کیا ہے کہ تنقید عیب چینی کے مفہوم کو مستلزم نہیں بلکہ اس کے معنی جانچنے اور پرکھنے کے ہیں اور جانچ پرکھ کی کسوٹی رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی ہے۔

کتاب کا تیسرا باب اجتماعی، تمدنی اور فقہی مسائل کی بحثوں پر محیط ہے۔ فقہی مسائل میں زکوۃ، صالح جماعت میں فقہی اختلافات کی حدود، دعا، استخارہ، خواب اور کرامت اور عذر شرعی کے موضوعات شامل ہیں۔ چند موضوعات اقامت دین کا کام کرنے والوں کو اختلاف حالات واحوال کے تناظر میں پیش آنے والے مسائل سے متعلق رہنمائی پر مشتمل ہیں۔

۱۴۔ تنقیدات

یہ کتاب مولانا اصلاحیؒ کی ان دنوں کی یادگار ہے جب وہ جماعت اسلامی میں شامل تھے اور دعوت کے کاموں میں مولانا مودودی کے دست وبازو تھے۔ جماعت کے لیے مولانا اصلاحی کی فدویت کا یہ عالم رہا کہ جدھر سے بھی جماعت کو نشانہ بنایا گیا، مولانا دفاع کے لیے سینہ سپر ہو گئے اور جماعت کی حمایت کے لیے قلمی محاذ کھول دیا۔ ان کے تمام تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقیدات" کے نام سے شائع ہوا۔ ان تنقیدی مضامین سے متعلق مولانا فرماتے ہیں:

> "دراصل یہ مضامین میں نے اپنے دفاع میں لکھے تھے کیونکہ جماعت میں ہوتے ہوئے اس کی زد براہ راست مجھ پر بھی پڑتی تھی"۔

مولانا کا یہ امتیاز ہے کہ وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں اس کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ تنقیدی مضامین میں لگتا ہے کہ یہ رنگ زیادہ نمایاں ہو کر ابھرا ہے۔ وہ فریق مخالف پر ایسا بھرپور وار کرتے ہیں کہ اسے

چت گرا دیتے ہیں اور سنبھلنے کا موقع بھی نہیں دیتے۔ ان مضامین میں مولانا نے مختلف سیاسی، معاشرتی، تمدنی، اجتماعی، فقہی اور عقائدی مسائل و نظریات پر تفصیل کے ساتھ تنقید کر کے ان کے غلط پہلوؤں کی تردید کی ہے اور ان کے جو صحیح پہلو ہو سکتے ہیں ان کو دلائل کے ساتھ واضح کیا ہے۔ یہ مضامین آج بھی اہمیت و افادیت کے حامل ہیں کیونکہ ان مضامین کے افکار و نظریات کی صدائے بازگشت اب بھی مختلف حلقوں میں موجود ہے۔

تنقیدات ان پانچ بڑے عنوانات پر مشتمل ہے۔

۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نیشنلسٹ لیڈر تھے یا نبی اور رسول؟

۲۔ حاکمیت الٰہی یا حاکمیت جمہور؟

۳۔ جماعت اسلامی پر الزامات اور ان کا جواب

۴۔ نئی فرد قرارداد جرم۔

۵۔ مسودہ قانون وضاحت قانون شریعت بابت ۱۹۵۲ء

پہلے عنوان کے تحت مولانا اصلاحی نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے اس نقطہ نظر کی نفی کرتے ہوئے کہ حضرت موسیٰ کی بعثت قومی آزادی کے لیے ہوئی تھی، قرآن مجید سے استدلال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ حضرت موسیٰ نے نہ تو قومی آزادی کا نعرہ لگایا، نہ نسلی اور وطنی تحریک چلائی بلکہ وہ اول تا آخر اللہ کے نبی اور رسول تھے اور انھوں نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے وہی دعوت پیش کی جس کے لیے اللہ تعالیٰ انبیاء کو مبعوث کرتا رہا ہے۔

دوسرا عنوان ایک وفاقی وزیر کی اسلام سے متعلق ہرزہ سرائی کی تردید پر مشتمل ہے۔ انھوں نے حاکمیت الٰہی کے بجائے حاکمیت جمہور کا نظریہ پیش کیا تھا اور اس کے حق میں اسلام کو استعمال کیا تھا۔ مولانا اصلاحی نے وزیر موصوف کے ایک ایک نظریے کا سخت محاکمہ کیا ہے اور اس کی غلطی بے نقاب کی ہے اور قرآنی دلائل کی روشنی میں حاکمیت جمہور کی تردید کر کے حاکمیت الٰہی کا اثبات کیا ہے۔

تیسرا اور چوتھا مضمون جماعت اسلامی پر اعتراضات اور ان کے جواب پر مشتمل ہیں۔ یہ مضمون مولانا عبدالرشید محمود گنگوہی نیز مولانا اصلاحی کے دیرینہ دوست مولانا محمد منظور نعمانیؒ کے مضامین کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ مولانا اصلاحیؒ نے اپنے طریق اور مزاج کے مطابق ایک ایک الزام پر الگ الگ بحث

کی ہے اور اس طرح تمام الزامات کا مدلل، باوقار اور علمی جواب دیا ہے۔ مباحث اگرچہ تنقیدی نوعیت کے ہیں لیکن ان میں نہایت اونچے علمی مذاق کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا پانچواں موضوع مسودہ قانون وضاحت قانون شریعت بابت ۱۹۵۴ء ہے۔ یہ مضمون بیگم سلمیٰ تصدق حسین کے پنجاب اسمبلی میں پیش کردہ ایک مسودہ قانون پر نقد و تبصرہ ہے۔ بیگم صاحبہ کا مسودہ شادی، فسخ نکاح، طلاق، مہر، تعدد ازدواج، حضانت اور نان و نفقہ وغیرہ کے عنوانات پر محیط تھا۔ جس میں اسلامی تعلیمات سے انحراف کرتے ہوئے اپنے مزعومات کے مطابق خامہ فرسائی کی گئی تھی۔ مولانا اصلاحی نے اس مسودہ کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ اس کے نظریات پر بھرپور تنقید کی، اس کی مضرتوں اور نقصانات کو واضح کیا اور قرآن و حدیث اور اسلامی فقہ کے استدلالات سے ان موضوعات کی تشریح کی۔

۱۵۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ

۱۹۵۵ء میں حکومت پاکستان کی سرپرستی میں ایک کمیشن قائم کیا گیا جس کے ذمے عائلی مسائل کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مرتب کرنے کا کام لگایا گیا تھا۔ شومئ قسمت سے یہ کمیشن ان افراد پر مشتمل تھا جو مغربی علوم میں کچھ درک تو رکھتے ہوں گے لیکن بہر حال اسلامی تعلیمات اور ان کے ماخذ کی ان کو ہوا بھی نہیں لگی تھی۔ کمیشن کی رپورٹ کا مطالعہ کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اسلام کی تحریف و تضحیک کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں پہلے اجتہاد کی ضرورت پر ایک طویل بحث کی ہے۔ پھر اجتہاد کی نئی تعریف کر کے اپنی سفارشات کو جائز اور معقول ثابت کرنے کے لیے ائمہ و مجتہدین کے اصولوں کے خلاف اجتہاد کے کچھ نئے اصول اختراع کیے ہیں۔ یہ نئے اصول کمیشن کی اسلام سے بے خبری اور کھلی ہوئی جہالت کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔

مولانا اصلاحی نے رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اجتہاد کے لیے ضروری علم، کردار اور اوصاف بیان کیے ہیں۔ کمیشن کے نئے اصولوں کے نقصانات اور مفسدات واضح کیے ہیں اور ان کی گمراہی کو حسب معمول مضبوط دلائل سے بے نقاب کیا ہے۔ مولانا اصلاحی نے کمیشن کی سفارشات کا سخت اور بے رحم علمی محاکمہ کیا ہے، ان کا خلاف اسلام ہونا ثابت کیا ہے، ان کے ان گنت مفسدات اور مہلکات اجاگر کیے ہیں۔ اس تبصرہ میں مولانا کی فقیہانہ بصیرت پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔

(جاری ہے)

تبصرہ کتب

اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ۔ عہد فیروز شاہی کے ہندوستان میں

تصنیف: ظفر الاسلام اصلاحی

ناشر: ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہندوستان میں مسلم دور حکومت (۱۲۰۶ تا ۱۸۵۷ء) عام طور پر عہد وسطیٰ کے ہندوستان کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ دور سیاسی، سماجی اور علمی و تمدنی حیثیت سے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ مؤرخین نے عام طور پر اس دور کی تاریخ کو سیاسی واقعات، فوجی مہمات، فتوحات کی تفصیلات، تخت و تاج کے حصول کے لیے امراء اور درباریوں کی باہمی کشمکش، شاہانہ عیش و عشرت کی داستان بنا کر رکھ دیا ہے۔ انگریز اور ہندو مؤرخین نے تو یہ راہ تعصب کی وجہ سے اختیار کی تھی مگر نہایت افسوس کی بات ہے کہ جدید مسلم دانش ور اور اہل قلم بھی اسی ڈگر پر چل نکلے اور انھوں نے انھی کی پیروی میں معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا اور مسلم حکمرانوں کو مطعون کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم دور حکومت میں دین و مذہب، تمدن و ثقافت اور سیاست و حکومت کے بارے میں حکمرانوں کی خدمات نہایت اہم اور مفید رہیں۔ فاضل مصنف کا موضوع اگرچہ عہد فیروز شاہی میں اسلامی قوانین کی ترویج و تنفیذ ہے مگر انھوں نے سارے مسلم دور حکومت کی علمی، سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور تمدنی خدمات کو اجاگر کیا ہے۔ خاص طور پر اس دور میں ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات اور مسلمان حکمرانوں کے ہندوؤں کے ساتھ نیک برتاؤ کو نہایت وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان کی تحقیق نہایت عمدہ اور مفید ہے اور باقاعدہ مراجع سے مؤید ہے۔ انھوں نے اس تاثر کو دور کرنے کی کوشش کی ہے جو مؤرخین نے مسلم حکمرانوں کے خلاف پھیلایا ہے۔

کتابچہ کی ضخامت ۱۵۰ صفحات ہے اور یہ ابتدائیہ اور چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں عہد فیروز شاہی کی فقہی خدمات، فتاویٰ پر کتب، عصری مسائل، غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات، ہندوؤں کے ساتھ برتاؤ، اسلامی قانون اور شریعت کی روشنی میں محاصل کے نظام اور سماجی اصلاحات سے متعلق نہایت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔

سلطان فیروز شاہ تغلق کی زیر نگرانی فتاویٰ پر مشتمل جو کتابیں تالیف ہوئیں ان کے تعارف سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور کے عصری مسائل کچھ کم پیچیدہ نہیں تھے۔ اس وقت کے علماء و فقہاء کی کاوش اور سلطان کی توجہ سے نہ صرف ان مسائل کا حل تلاش کیا گیا بلکہ اس اجتماعی جدوجہد سے تیار ہونے والے اسلامی قوانین کو عملی طور پر نافذ بھی کیا گیا۔ اس دور کی یہ کوشش موجودہ دور کے مسائل کے حل کے لیے ایک ایسی نہج فراہم کرتی ہے جسے اختیار کر کے موجودہ دور کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ (ع۔ غ۔ ا)

اسلام کا تصور جرم و سزا

تالیف : خورشید احمد ندیم

ناشر : عالمی ادارہ فکر اسلامی ۲۸ مین روڈ F-10/2 اسلام آباد

یہ کتاب عالمی ادارہ فکر اسلامی کی پہلی پیشکش ہے۔ یہ ادارہ ۱۹۸۱ء میں امریکہ میں قائم ہوا تھا۔ اس کا مقصد تمام علوم بالخصوص اجتماعی علوم کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کے علاوہ امت مسلمہ کے علمی، تہذیبی اور تمدنی تشخص کی تلاش اور بحالی بیان کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے جو کتب شائع کی جائیں گی ان کو معاصر فکر اسلامی کا نام دیا گیا ہے اور ان کے سیریز ایڈیٹر (پاکستان) ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری ہیں۔ زیر نظر کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں اسلامی سزاؤں کی حکمت و فلسفہ پر بحث کے علاوہ قتل، ارتداد، شراب نوشی کی سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بتایا گیا ہے کہ حدود اور تعزیر میں کیا فرق ہے۔ ثبوت جرم کے طریقہ، عورت کی شہادت، قید کی سزا اور موت کی سزا پر مختلف علمائے کرام کی آراء نقل کی گئی ہیں۔ اس کے آخری باب کا عنوان تنبیہات ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ اسلامی سزاؤں کا نفاذ کن حالات میں ہونا چاہیے۔ مختلف علمائے کرام کی یہ تحریریں ۱۹۷۰ء کے بعد کے عرصہ کی ہیں۔ یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی مفید ہے کہ ایک مسئلہ پر مختلف اہل علم کی طرف سے جو کچھ شائع ہوتا رہا ہے اس کو یکجا کر دیا گیا ہے۔ حتی کہ اس میں ایسے اصحاب کی رائے بھی نقل کر دی گئی ہے جن کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لئے کوئی شخص کسی بھی مسئلہ پر جو بھی رائے رکھتا ہو اس کو اپنے حق میں دلائل اور حوالے مل جائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب کسی مسئلہ پر کسی نتیجہ پر پہنچنے میں مدد نہیں دیتی۔ نہ ہی فاضل مرتب نے تمام آراء کا محاکمہ کر کے اپنی رائے درج کی ہے۔

کتاب کی دوسری جلد مکمل طور پر رجم کے مسئلہ سے متعلق ہے جس میں رجم کے متعلق بنیادی مضمون مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر تدبر قرآن کا اقتباس ہے اور بعد میں ان کی رائے سے اختلاف رکھنے والے علماء کے مضامین کو جمع کر دیا گیا ہے۔ جاوید احمد غامدی صاحب نے مولانا اصلاحی کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ کتاب کے مقدمہ میں دینی اداروں کے قیام کے تعارف اور ان کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے ممتاز علمائے کرام کا سرسری تعارف کرا دیا گیا ہے۔

ہمارے نزدیک کتاب کی تالیف اور اشاعت پر جو محنت اور سرمایہ صرف کیا گیا ہے وہ اس سے بہتر کسی کام پر صرف ہونا چاہیے تھا۔

(م-س)

تالیفات امام حمید الدین فراہی

	روپے پیسے
1۔ مجموعہ تفاسیر فراہی	328 - 00
2۔ حکمت قرآن	84 - 00

تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

1۔ تدبر قرآن کامل۔ (9 جلد)	2,952 - 00
(فی جلد) :	328 - 00
2۔ مبادی تدبر قرآن	105 - 00
3۔ مبادی تدبر حدیث	90 - 00
4۔ حقیقت شرک و توحید	144 - 00
5۔ حقیقت نماز	54 - 00
6۔ حقیقت تقویٰ	54 - 00
7۔ تزکیہ نفس : جلد دوم	105 - 00
8۔ دعوت دین اور اس کا طریق کار	105 - 00
9۔ اسلامی قانون کی تدوین	78 - 00
10۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل	78 - 00
11۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام	105 - 00
12۔ قرآن میں پردے کے احکام	12 - 00
13۔ فلسفے کے بنیادی مسائل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں	120 - 00
14۔ تفہیم دین	90 - 00
15۔ مقالات اصلاحی : جلد اول	165 - 00

فاران فاؤنڈیشن

122 ۔ فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور۔ 54600۔ پاکستان

فون = 7595200